اب میں
وہاں
نہیں رہتا
دیپک بُدکی

دیپک بدکی

اب میں وہاں نہیں رہتا

مصنف کی تصانیف

☆افسانوں کے مجموعے:

ا۔ادھورے چہرے (اردو اور ہندی)

۲۔چنار کے پنجے (اردو اور ہندی)

۳۔زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

۴۔ریزہ ریزہ حیات

۵۔روح کا کرب

۶۔اب میں وہاں نہیں رہتا

۷۔مُٹھی بھر ریت (افسانچوں کا مجموعہ)

☆تنقیدی مضامین و تبصروں کے مجموعے:

۸۔عصری تحریریں

۹۔عصری شعور

۱۰۔عصری تقاضے

مصنف پر لکھی گئی کتابیں

ا۔دیپک بدکی کی افسانہ نگاری (جاوید اقبال شاہ)

۲۔ورق ورق آئینہ۔دیپک بدکی: شخصیت اور فن

(پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری)

ملنے کا پتہ:

(۱) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۰، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

(۲) میزان پبلشرز و ڈسٹری بیوٹرس بٹہ مالو، بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈ کوارٹرس، سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۹

اب میں وہاں نہیں رہتا

دیپک بُدکی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

AB MAIN WAHAN NAHIN REHTA

(Collection of Short Stories)

by

Deepak Budki

Year of Edition 2017
ISBN 978-93-86486-00-4

Price Rs. 200/-

نام کتاب : اب میں وہاں نہیں رہتا (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : دیپک بُدکی

پتا : ۱۰۲-اے، ایس جی امپریشن، سیکٹر ۴-بی، وسُندھرا، غازی آباد-۲۰۱۰۱۲

ای میل : deepak.budki@gmail.com

قیمت : ۲۰۰ روپے

سنہ اشاعت : ۲۰۱۷ء

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی-٦

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

اپنے ماماجی
آنجہانی مکھن لال نہرو
کے نام

تحریر ظہری

اس مجموعے کے سبھی کردار، مقامات اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی شخص، مقام یا واقعہ سے کوئی مناسبت محض اتفاق ہوسکتا ہے جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمّے داری عاید نہیں ہوگی۔

÷÷÷÷÷

سپاس نامہ

اس مجموعے میں بیس افسانے شامل ہیں جو برصغیر کے مختلف رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔اشاعت کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

گونگے سناٹے (ماهنامه شاعر ممبئی، فروری ١٦ ١ء)؛ایک انقلابی کی سرگزشت؛دودھ کا قرض (هندی / کوشر سماچار ستمبر ١٦ ١ء)؛ہرکارہ (هندوستانی زبان، جلد ١، شماره ٢، اکتوبر – دسمبر ١٥ ١ء)؛اب میں وہاں نہیں رہتا (ماهنامه آج کل، نئی دهلی،جنوری ١٦ ١ء؛انتساب عالمی سرونج [دیپك بُدكی نمبر] ،جلد ٤ شماره ٣،جولائی – ستمبر ١٦ ١ء)؛ ایک معصوم کی دردناک موت (انتساب عالمی، سرونج بعنوان سوری میڈم ،جولائی – ستمبر ١٦ ١ء)؛آگ کا دریا (دوماهی اختر پاکستان، اکتوبر ١٥ ١ء؛بیباك مالیگاؤں،نومبر ١٥ ١ء)؛اپنے اپنے زاویے (تریاق ، ممبئی ،جلد ، ، شماره ٥ ، فروری ١٦ ١ء)؛میری کہانی کا کردار (ماهنامه تخلیق لاهور ،پاکستان ،جلد ٤٧، شماره ٣، مارچ ١٦ ١ء؛جهاں نما گنگوه جلد ٢ ، شماره ٨ ، اگست ١٦ ١ء)؛ جاگتی آنکھوں کے خواب (سه ماهی دربهنگه ٹائمز،شماره ٨ – ٧)؛ڈاک بابو (اسباق ، پونے جلد ٣٥ ، اکتوبر – دسمبر ١٥ ١ء)؛لہو کے گرداب (انتساب عالمی جلد ٣، شماره ٩ ، نومبر ١٥ ١ء – جنوری ١٦ ١ء)؛طالب بہشت (ماهنامه کائنات آن لائن ، شماره ٧٧ ، اگست ١٦ ١ء)؛ایک بے کار آدمی کی کہانی (نگینه جلد ١ ، شماره ٤،

مارچ – مئی ۱٦ء)؛ گواہوں کی تلاش؛ معصوم کنواں (شعر و سخن مانسہرہ پاکستان، جلد ۱۷، شمارہ ٦۸، اکتوبر – دسمبر ۱٦ء)؛ پرت در پرت لوگ (اردو کاوش، جلد ۳، شمارہ۹، اکتوبر – دسمبر ۱۵ء)؛ یوم حساب (شاندار اعظم گڑھ)؛ فرض شناس؛ اندھیر نگری (سہ ماہی شعر و سخن، مانسہرا، پاکستان، بعنوان منّین محافظ، اندھا راجہ، جلد ۱۷، شمارہ ٦٦، اپریل – جون ۱٦ء)

میں مذکورہ بالا رسائل کے مدیروں کا تہہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے میرے افسانوں کو اپنے موقر رسالوں میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ ان دوستوں، ادیبوں اور قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے خاکسار کی کوششوں کو سراہا اور اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔

اس مجموعے کی کمپوزنگ، ترتیب و تزئین میں نے خود کی ہے تاہم پبلشر کی محبتوں کا اعتراف کرنا میرا فرض بنتا ہے کیونکہ اس کی کوششوں کی بدولت ہی یہ مجموعہ منظر عام پر آسکا ہے۔

دیپک بُدکی

☆☆☆

فہرست

پیش لفظ

گزشتہ صدی میں اردو افسانے نے کئی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ ہر مرحلے پر اسے نئی زندگی اور نئی توانائی ملتی رہی۔ غرض و غایت بدلتی رہی، ہیئت بدلتی رہی اور اسلوب بھی بدلتا رہا۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں جب اردو افسانے کی ابتدا ہوئی اس کا مقصد محض تفریحی تھا مگر رفتہ رفتہ یہ صورتحال بدل گئی۔ شروعات اصلاحی افسانوں سے ہوئی، پھر سجاد حیدر یلدرم اور اس کے مقلدوں نے رومانیت کو اپنا شعار بنا لیا جبکہ پریم چند اور اس کے پیروکاروں نے حقیقت پسندی اختیار کر لی۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا جس میں پہلے پہل سوشلزم اور مساوات پر زور دیا گیا لیکن بعد میں افسانے مارکسی اشتہار بن گئے۔ متوازی رجحان کے طور پر فرائیڈ کی نفسیات نے بھی افسانوں میں اپنی جگہ بنالی۔ اگلی منزل جدیدیت پسندی کی تھی جہاں علامتوں، استعاروں، تلازمۂ خیال اور شعور کی رو کا چلن رہا۔ جدید گردباد میں کہانی کی روح غائب ہوگئی اور قلم کار قاری سے دور ہو گیا۔ کسی نقاد کو افسانے کی موت نظر آئی اور کسی کو افسانہ نگار کی۔ آخرش آٹھویں دہائی میں افسانے میں کہانی پن لوٹ آیا اور قاری اور قلم کار کے درمیان پھر سے پُل استوار ہو گیا البتہ مغرب کی تقلید میں قلم کار مصلحتاً متن سے غائب رہنے کی کوشش کرتا رہا اور قاری کو براہ راست متن سے جوڑنے میں جٹ گیا۔ اب مابعد جدیدیت دور میں کئی مسائل پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے مثلاً آرٹ کا مدعا، قاری اور قلم کار کا رشتہ، عمل بیان، تشکیل و ردِ تشکیل وغیرہ۔ اس تناظر میں ادب اکیسویں صدی میں داخل ہو چکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ادب اپنے نامیاتی ارتقا کے دوران نئے نئے سانچوں میں ڈھلتا رہا، قلبِ ماہیئت کرتا رہا مگر کبھی مرنے کا نام نہیں لیا۔

ایک عجیب سا سوال میرے ذہن میں بار بار اٹھتا ہے کہ مجھے کیا اور کیسے لکھنا چاہیے؟
معاصر فیشن کی نقالی میں وقت کے ساتھ بہنا چاہیے، جہاں ناموری ہے، نقادوں کی واہ واہی ہے،
انعام واکرام ہیں یا پھر اپنی اجتہادی ڈگر پر چلتے رہنا چاہیے، جہاں نظر اندازی ہے، گم نامی ہے اور
ناقدری ہے تاہم انسانی رشتوں کا آئینہ خانہ ہے، بوسیدہ اخلاقیات کا حصار ہے اور تخریب وتعمیر کا
تصادم ہے۔ میرے ضمیر نے مجھے ہمیشہ دوسرے راستے پر چلنے کی رہبری کی جس کے سبب میں اس
راہ پر، اکیلا ہی سہی، گامزن رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے افسانوں کے توسل سے تفریح کے ساتھ
ساتھ اپنی فکر وسوچ اور اپنے نقطۂ نظر کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں نے علامتوں اور
استعاروں کا سہارا نہیں لیا مگر ان کو منزل تک پہنچنے کا صرف وسیلہ بنایا، منزل نہیں۔ دو ایک جگہ جہاں
ضرورت محسوس ہوئی کہانی کو تجریدی رنگ میں بھی پیش کیا۔ پھر بھی بیانیہ کو کبھی ترک نہیں کیا کیونکہ
مجھے اس بات کا ہمیشہ احساس رہا کہ قاری کہانی کو اسی طرح انجوائے کرنا چاہتا ہے جیسے وہ بچپن میں
دادی سے کہانی سن کر محظوظ ہوتا تھا۔ ان کہانیوں میں روانی تھی، انجذاب تھا، تحیّر تھا، تجسس تھا، تعلیق
تھی، منتہا تھا اور غیر متوقع اختتام تھا۔ یہ احساس میرے فکر وخیال کو مہمیز کرتا رہا۔ میں نے اپنے
سمند تخئیل کو ہمیشہ کھلا چھوڑا مگر سائنسی میلان کے سبب استنباط اور استخراج سے کام لے کر معروضیت
اور معقولیت کو ہمیشہ ترجیح دی۔ یہی میری پہچان ہے اور میں اس راستے کو اپنا مخصوص راستہ مانتا ہوں
۔ میرے قارئین بھی اسی راہ پر میرے ساتھ چلتے رہے ہیں کیونکہ انھیں میری کہانیوں کا یہی رنگ
پسند ہے جن میں نہ وقتی رنگ آمیزی ہے، نہ جذباتی بلیک میل ہے اور نہ ہی الفاظ کی شعبدہ بازی۔

اس سلسلے کا میرا تازہ افسانوں کا مجموعہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' حاضر خدمت ہے۔ امید
ہے گذشتہ مجموعوں کی مانند ہی قارئین اسے پسند فرمائیں گے اور اپنے تاثرات سے نوازیں گے۔

وسُندھرا، غازی آباد (یوپی)

دیپک بدکی

۱۸ نومبر ۲۰۱۶ء

گونگے سنّاٹے

یہ ایک سچّی کہانی ہے مگر میری گزارش ہے کہ ان کرداروں کو آپ ڈھونڈنے نہیں نکلنا کیونکہ اب وہ وہاں پر نہیں رہتے ہیں۔ نہ جانے ٹرانسفر ہو کر کہاں چلے گئے۔ منوہر کھرے کام تو کسی اور سنٹرل دفتر میں کرتا تھا مگر عبوری طور پر رہتا تھا کسی اور محکمے کے گیسٹ ہاؤس میں۔ یہ ساری مہربانی اس کے دوست دامودر پٹیل کی تھی جو دوسرے محکمے میں ڈائریکٹر تھا اور گیسٹ ہاؤس کا انصرام اس کے پاس تھا۔ دامودر پٹیل نے اسے گیسٹ ہاؤس میں رہنے کی اجازت دی تھی حالاں کہ قانوناً یہ جائز نہیں تھا۔ خیر قانون بنتا ہی ہے خلاف ورزی کرنے کے لیے۔ کچھ افسر ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں حکم عدولی میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ پٹیل نے زندگی میں جیو اور جینے دو کی پالیسی اپنائی تھی۔ خود بھی کھاتا تھا، افسروں کو بھی کھلاتا تھا اور ماتحتوں کو کھانے کے مواقع فراہم کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کسی نے کبھی انگلی نہیں اٹھائی۔ منوہر کھرے نے بھی یہی طور طریقے اپنائے تھے۔ اس کی شخصیت میں کچھ عجیب سی مقناطیسی کشش تھی جس کے سبب وہ اجنبیوں کو منٹوں میں دوست بنالیتا تھا۔ اور یہ دوستی کا جال ہر سٹیشن کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ منوہر اور دامودر میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کی دوستی کا راز چند ہی دنوں میں مجھے معلوم ہوا۔ دونوں رنگ رسیا قسم کے آدمی تھے۔ اکثر شراب اور شباب کی پارٹیوں میں اکٹھے شریک ہوجاتے۔ پارٹی کے بعد معشوقاؤں کو اپنے ساتھ لے جاتے اور اکثر رات میں بستر بدل جاتے۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ شراب اور شباب کی دوستی بہت گہری ہوتی ہے۔ سو وہ بھی ایک دوسرے کے لیے جان چھڑکتے تھے۔

دامودر پٹیل کی ان پڑھ بیوی گاؤں میں رہتی تھی۔ ادھیڑ عمر کی ہوجانے کے باوجود

گھونگھٹ میں رہنا پسند کرتی تھی۔ ہفتے کے آخیر میں دامودر اس کے پاس حاضری دے آتا جسے وہ بھگوان کا آشیرباد سمجھ لیتی تھی۔ اس کے برعکس منوہر کھرے کی بیوی بہت ہی روشن خیال قسم کی عورت تھی۔ ممبئ میں الگ فلیٹ میں رہتی تھی۔ اکثر قمیص اور جینز پہنتی تھی جو اس کے فربہ جسم کو اور بھی نمایاں کر دیتا تھا۔ کچھ ایکسپورٹ کا کام کرتی تھی اور دنیا کے دور دراز ممالک میں اکیلی گھوما کرتی تھی۔ بہن نیوزی لینڈ میں تھی، کبھی کبھار مہینہ بھر وہاں گزار آتی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بے نیاز اپنی ہی دنیا میں مست رہتے تھے۔ جب بھی کبھی ملتے، ایک دوسرے کو ٹینشن دے کر جاتے۔ ایک جوان لڑکی چندریکا تھی جو باپ کے پاس رہتی تھی کیونکہ ماں کا کہیں کوئی ٹھکانہ نہ تھا، کب ہندستان میں رہے گی اور کب کسی اور ملک میں ہوگی۔ ممبئ میں اکیلے دن گزارنا اور وہ بھی جوان لڑکی کا بہت مشکل تھا۔

میں سامنے دوسرے گیسٹ ہاؤس میں رہتا تھا۔ کبھی کبھار صبح دفتر کے لیے نکل جاتا تو چندریکا کے درشن ہو جاتے۔ وہ اپنے کالج کے لیے جا رہی ہوتی۔ وہ نظریں جھکا لیتی اور جلدی سے کھسک کر سیڑھیاں اتر جاتی۔ اس کے چہرے پر نہ جانے کیوں اداسی سی چھائی رہتی تھی۔ پڑوسی ہونے کے ناتے میں نے کئی بار ہیلو کہا مگر اس نے میرے ہیلو کا جواب کبھی بھی نہ دیا۔ یہ اس کا غرور نہیں تھا بلکہ مجھے اس کے اندر کچھ خلا سا نظر آ رہا تھا جس کو پورا کرنے کے لیے اس نے خاموشی اوڑھ رکھی تھی۔

ایک روز اچانک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سامنے گیسٹ ہاؤس سے بہت شور و غل سنائی دے رہا تھا۔ میں نے جونہی اپنا صدر دروازہ کھولا سامنے والے گیسٹ ہاؤس سے منوہر کھرے کی نوکرانی دوڑتی ہوئی میرے گیسٹ ہاؤس میں پناہ لینے کے لیے گھس گئی۔ وہ رو رہی تھی اور مجھ سے التجا کر رہی تھی۔ ''سر مجھے بچاؤ.... سر مجھے بچاؤ...... یہ عورت مجھے مار ڈالے گی.... سر مجھے بچاؤ۔''

اس کے تعاقب میں منوہر کھرے کی ہٹی کٹی بیوی، جو شاید اسی روز وارد ہوئی تھی، میرے

گیسٹ ہاؤس کے اندر گھس گئی۔ نہ اجازت لی اور نہ ہیلو کہا۔ ہاتھ میں بانس کا ڈنڈا تھا۔ وہ نوکرانی کو مارنے لگی مگر میں دونوں کے درمیان کھڑا ہو کر اس کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ مسز کھرے خشمگیں آواز میں چلانے لگی۔ "لیو ہَر ....لیو ہر ...شی اِز اے بِچ ...آپ اس کو چھوڑ دو...آپ کو معلوم نہیں ...یہ منوہر کے ساتھ سوتی ہے۔ میری سوتن بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ شی از اے بچ.... بلڈی بچ...!"

میں راستے سے نہیں ہٹا اور اس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر بھی اس کا فتور کم نہیں ہو رہا تھا۔ اس درمیان منوہر کھرے بھی کمرے کے اندر آ گیا اور اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

"اب اسے چھوڑ بھی دو۔ چلو میں اس کو نکال کر کل سے کسی اور کو کام پر رکھ لوں گا۔"

دریں اثنا نوکرانی سہمی سہمی ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ میں نے دونوں میاں بیوی کو صوفے پر بٹھایا اور ان سے پوچھا۔ "اس عورت نے کیا غلطی کی کہ آپ لوگ اس کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟"

مسز کھرے، جو ڈبلیو ڈبلیو ایف کی پہلوان جیسی لگ رہی تھی، سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور اس سے قدرے ہٹ کر اس کا مریل سا شوہر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد مسز کھرے مجھ سے کہنے لگی۔ "یو نو، دِس لیڈی از اے ویمپ۔ اس نے میرے شوہر کو اپنے وَش میں کر لیا ہے۔ یہ نہ صرف اس کا کھانا بناتی ہے بلکہ اس کا بستر بھی گرم کرتی ہے۔ میں نے کتنی بار منوہر کو ٹوکا مگر وہ مانتا ہی نہیں ہے۔ اس کو چینج کرنے کے لیے راضی ہی نہیں ہوتا۔ اس کو دفتر میں کیجو ول مزدور لگا رکھا ہے، تنخواہ وہاں سے ملتی ہے جبکہ یہاں پر اس کے ساتھ گلچھرے اڑاتا ہے۔ شیم لیس گائے۔"

"آپ کو کیسے معلوم کہ یہ اس کے ساتھ سوتی ہے؟ ہوسکتا ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"اوہ نو، ڈونٹ تھنک آئی ایم دیٹ نائیو۔ مجھے سب کچھ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کیا ہو رہا

ہے۔میں یہاں کی پل پل کی خبر رکھتی ہوں۔رات کو یہ اس کو شراب پلا کر اپنے بستر میں سلاتا ہے۔

چھی ،سی وہاٹ اے چوائس ہی ہیز۔"

"آپ یہاں اپنے شوہر کے ساتھ کیوں نہیں رہتی؟ آخر اس کی بھی تو کچھ ضروریات ہیں۔آپ کے آنے سے اس کی تشنگی دور ہو جائے گی۔پھر وہ کسی دوسری کے پاس کیوں چلا جائے گا؟"

"اوہ نو۔ہاؤ از اِٹ پوسبل؟ میں ممبئی کے بغیر کہیں اور رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔وہاں میرا بزنس چلتا ہے۔میرا فرینڈ سرکل ہے۔یہاں آکر کیا کروں گی؟ممبئی میں میرا بہت اچھا فلیٹ ہے۔کبھی آکر دیکھ لینا۔میں کاندی وَلی میں رہتی ہوں۔"

"ہاں ضرور جب کبھی میں ممبئی آجاؤں گا آپ سے ضرور ملوں گا۔ اپنا ایڈریس دے دیجیے گا۔"

"یس وہائی ناٹ۔منوہر سے میرا ایڈریس لے لینا۔"

منوہر کھرے کا چہرہ دفعتاً اتر گیا۔اسے لگا جیسے دوسرے ہی روز میں ممبئی کی ٹکٹ لے کر مسز کھرے کے پاس جانے والا ہوں۔وہ اپنی بیوی کی بات کاٹ کر بولا۔"آپ ممبئی جا کر ان سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔یہ تو وہاں ہوتی ہی نہیں ہے۔کبھی بہن کے پاس نیوزی لینڈ چلی جاتی ہے، کبھی کسی اور رشتے دار کے پاس جاتی ہے یا پھر غیر ممالک کی سیاحت پر ہوتی ہے۔ممبئی میں اس کا ملنا بہت مشکل ہے۔"

منوہر کھرے کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا کہ مجھے ملی یہ دعوت اس کو اچھی نہیں لگی۔یا تو اسے یہ خدشہ تھا کہ میں اس کی بیوی کو پھانس نہ لوں یا پھر مجھے اس کی اصلیت معلوم نہ ہو جائے۔اس کے برعکس مجھے ان دونوں کی زندگی پر ترس آرہا تھا۔انھیں فردا کی فکر ہی نہ تھی۔چند لمحاتی مسرتوں کے لیے انھوں نے اپنی جوان بیٹی کو بھلی چڑھایا تھا۔انسان جب اپنی جبلی خواہشوں کا غلام

بن جاتا ہے تو اپنے مستقبل کو بھی گروی رکھ لیتا ہے۔ میرے اندر جذبات کا ایک طوفان سا اُمڈ آیا اور مجھ سے رہا نہ گیا۔ مسز کھرے سے مخاطب ہوا۔ ''یہ بتائیے کہ آپ اپنی بیٹی کو اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے؟ آپ ماں ہیں۔ یہ آپ کا فرض بنتا ہے۔''

''اوہ، اٹ اِز اِمپوسبل۔ میں ممبئی میں کم ہی رہتی ہوں۔ پھر اس کی تعلیم کی طرف کون دھیان دے گا۔ یہاں اس کی سبھی ضروریات میسر رہتی ہیں۔''

''ضروریات...!'' میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ''ایک معصوم جوان لڑکی کی ضروریات اس کا اوباش باپ میسر رکھتا ہے۔...لیکن ماں اپنی بلوریں دنیا کو تج نہیں سکتی۔ ماں کا کام تھا حیض کی مانند اس کو بدن سے خارج کرنا، سو اس نے کر دیا۔ اب وہ جانے اور اس کا باپ۔''

مسز کھرے کی باتیں سن کر مجھے جنون سا طاری ہو گیا۔ اس نے میری نظروں میں ماں کا رتبہ کھو دیا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا، اس لیے بول اٹھا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ باپ اور بیٹی میں ناجائز تعلقات نہیں ہیں؟ مجھے شک ہو رہا ہے کہ باپ بیٹی کے ساتھ بدفعلیاں کرنے کا مرتکب ہے۔''

انسانی جذبات اس قدر مشتعل ہو سکتے ہیں مجھے گماں بھی نہ تھا۔ وقتی جنون میں مبتلا ہو کر میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے مگر مجھے اس کا احساس بعد میں ہوا کہ اگر یہ بات صحیح نہ ہوتی تو میرا کیا حشر ہوا ہوتا! چندریکا کا باپ مجھے قتل بھی کر سکتا تھا۔ پھر ایسا مخدوش اور گھنونا الزام ثابت کرنا مشکل بھی تو تھا۔ مگر کمان سے نکلا ہوا تیر اور منہ سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آتی۔ اس لیے میں من ہی من میں دعا کرنے لگا کہ بات طول نہ پکڑے بلکہ جلدی سے دب جائے۔

مسز کھرے کی بھنویں تن گئیں۔ وہ تلملا اٹھی۔ ''ہاں آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ چندریکا نے کئی بار مجھے اس بارے میں ٹیلی فون پر بتایا کہ یہاں پاپا شام کو شراب پی کر بہک جاتے ہیں۔.... میں یہاں رہنا نہیں چاہتی ہوں... مجھے واپس ممبئی لے جاؤ۔....'' شرم کے مارے وہ آگے وضاحت نہیں کر سکی۔

''جب آپ کو یہ سب کچھ معلوم ہے پھر بھی آپ نے اپنی بچی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ اسے اپنے پاس نہیں بلایا۔ تعجب کی بات ہے۔ اس کے برعکس آپ کو یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ آپ کا شوہر نوکرانی کے ساتھ ہم بستر ہوتا ہے۔ مجھے آپ کے اس رویے پر افسوس ہو رہا ہے۔ آپ کی ترجیحات پر حیرت ہو رہی ہے، مسز کھرے۔''

منوہر کھرے جواب تک خاموش تھا، اپنے آپ کا دفاع کرنے لگا۔ ''نو، نو، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھار میں اپنی بیٹی کو جنسی تربیت دیتا ہوں تاکہ مستقبل میں وہ ازدواجی زندگی کے لیے تیار ہو جائے۔''

اس کی بات سن کر مجھے ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا۔ ''ایک باپ اپنی بیٹی کو ازدواجی زندگی کے لیے تربیت دے رہا ہے۔ یہ کس صحیفے میں لکھا ہوا ہے۔ ماں اپنی بیٹی کو ازدواجی زندگی کے لیے تیار کرے، یہ تو میں نے سن لیا تھا مگر باپ اپنی بیٹی کو سیکس سے متعارف کرائے، یہ تو میں نے پہلی بار سن لیا۔''

مسز کھرے بھر گئی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ پھر سے الجھ گئی مگر شوہر اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ میں نے بات کاٹنا ہی مناسب سمجھا۔ اس لیے نوکرانی کو ہدایت دینے لگا۔ ''دیکھو تم رات بھر یہیں ڈرائنگ روم میں سو جاؤ اور صبح ہوتے ہی اپنے گھر چلی جانا۔ سمجھے۔ ابھی تم اپنے لیے کچن میں دو چار روٹی بنا لو۔ فرج میں کچھ سبزی پڑی ہوئی ہے اس کے ساتھ کھا لینا۔''

اس کے بعد میں مسز کھرے کی جانب مڑا۔ ''آپ کب ممبئی جا رہی ہیں؟''

''کل رات کو راجدھانی سے جا رہی ہوں۔ یہاں آ کر ہر بار میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب آپ لوگ جا کر سو جائیے اور نوکرانی کی فکر مت کیجیے۔ ہاں اپنی بیٹی کی فکر کرنا آپ کا فرض بنتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اس کو اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔''

اور پھر اگلا دن گزر گیا اور رات کے تین بجے وہ راجدھانی سے روانہ ہوگئی۔

دوسرے روز جب میں صبح سویرے دفتر کے لیے نکل پڑا، میرے سامنے چندریکا حسب معمول کتابیں بغل میں دبائے کالج جانے کے لیے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کا چہرہ معمول کی طرح مجروح و مضروب لگ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

ایک انقلابی کی سرگزشت

میری بوڑھی آنکھوں نے اسّی بہاریں اور اسّی پت جھڑ دیکھے ہیں۔ بہار تو خیر نام کے لیے آتی تھی ورنہ جن دنوں میں چھوٹا تھا میں نے کہیں چمن میں گل کھلتے دیکھے ہی نہیں۔ ہر طرف سیلاب، سوکھا، قحط، بھوک مری، غلامی اور بے روزگاری نظر آتی تھی۔ ملک پر فرنگیوں کا قبضہ تھا جو ہمیں غلامی کی زنجیروں میں ہمیشہ جکڑ کر رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ ہندستانیوں کو اپنا ملک چلانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اِدھر میں زندگی کے زینے چڑھتا گیا، اُدھر ملک کروٹیں لیتا رہا۔ کہیں عدم تشدد کا صور پھونکا جا رہا تھا اور کہیں تشدد لہو کی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں چرخے والا ترنگا نظر آ رہا تھا اور کسی کے ہاتھ میں درانتی ہتھوڑے والا سرخ پرچم۔

جوانی میں انقلاب، بغاوت اور جدلیات کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ابلتا خون رگ رگ میں دوڑنے لگتا ہے۔ سو میں نے بھی اپنی آنکھوں میں نئے عزم اور انقلاب کے خواب سنجوئے۔ مارکس، اینگلز اور لینن کو اپنا رہنما بنایا، پشکن، گورکی، دوستوفیسکی اور چیخوف کا مطالعہ کیا، ترقی پسند تحریک کا حصہ بن گیا اور احمری رہنماؤں کی خوش الحانی سے محظوظ ہوتا رہا۔ میں اس بات کا قائل ہو گیا کہ قوم کی تعمیر انفرادی ضرورتوں سے زیادہ اہم ہے۔

افسوس کہ آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی میرے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ فرنگی حکمرانوں نے انتہا پسندوں کی جگہ اعتدال پسندوں سے سمجھوتا کر لیا تا کہ خود انگریز منتقمانہ خونریزی سے بچ جائیں، ان کا بنایا ہوا راشی نظام بدستور چلتا رہے اور فرنگی کمپنیوں کا دبدبہ یوں ہی قائم رہے۔ اِدھر کمیونسٹ پارٹی بھی انتشار میں مبتلا ہو گئی، کئی قائدین پاکستان جا کر بس گئے، ہندستان میں

پارٹی کے ٹکڑے ہو گئے، کوئی مارکسی بن کر الگ ہو گیا اور کوئی نکسلی بن کر جنگلوں میں سرگرم ہو گیا۔ ہر روز ایک نیا مسیحا سامنے آتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان میں سے غریبوں کا حقیقی مسیحا کون ہے۔ ایک صدی کی تگ و تاز کے باوجود ہم دو تین ریاستوں سے آگے اپنا اثر و رسوخ نہیں بڑھا پائے۔

بنگال، تریپورا اور کیریلا میں میرے رفیقوں نے کرسیاں سنبھالیں۔ اب وہ جدلیاتی مادیت کو بھول کر انتخابات، سوشلزم اور مساوات کی باتیں کرنے لگے۔ جس ہندستان کے سپنے ہم نے مل کر دیکھے تھے اس میں نہ غربت کے لیے کوئی جگہ تھی، نہ استحصال کے لیے، نہ مذہب کے لیے اور نہ ہی ذات پات کے لیے۔ اس کے برعکس ہم نے تخریبی نظام کو ترجیح دی۔ ہندستان کچھ اور ہی بنتا جا رہا تھا۔ ہڑتالیں... چکا جام.... ملیں بند ... دفتر بند... کام ٹھپ ...! ہمارے رہنماؤں نے غریب رعایا کو برس ہا برس اپنے لیے قبریں کھودنے میں مصروف رکھا۔ روز بروز جاہلوں اور بے روزگاروں کی فوج بڑھتی رہی جبکہ رہنما اپنے منشور چاٹتے رہے۔ کوئی کسی کو ٹوکنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اب تو عوام کے بدلے ووٹ بنک کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مانا سیلاب، خشک سالی اور بھوک مری قدرت کی دین ہیں مگر آبادی تو روک سکتے تھے، ماحول کی حفاظت تو کر سکتے تھے، جنگلوں کی بے دریغ کٹائی تو روک سکتے تھے۔ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ میرے رفیقوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ جب تک اس ملک میں بھوک اور بیکاری ہے، ان کی تاجداری قائم ہے۔ اس لیے وہ غریبوں کی جھولیوں میں سبسڈیاں ڈال کر رجھاتے رہے۔ ہر الیکشن سے پہلے نئی فلاحی سکیموں کا اعلان کرتے رہے۔ ان سکیموں پر زمین پر کم اور کاغذ پر زیادہ عمل کرتے رہے اور ہر وہ موقع ڈھونڈتے رہے جسے ذاتی مالی منفعت بہم پہنچ سکے۔ دونوں سیاست داں اور افسر شاہی غیر ملکی کھاتوں میں اپنی بڑھتی بنک بیلنسوں کو دیکھ کر بغلیں بجاتے رہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آزادی کے بعد کمیونسٹ، جو لامذہبیت کا دعویٰ کرتے ہیں،

مذہبی بولیاں بولنے لگے۔ ہر سال کروڑوں روپے درگا پوجا پنڈالوں پر خرچ کرتے رہے۔ اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے کی بجائے ذات پات اور مذہبی الجھیڑوں میں دلچسپی لینے لگے۔ سچ پوچھو تو آزادی کے بعد مذہبی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں اور ان کے گرگوں کی تگڑی ہمارے ملک پر حاوی ہوگئی۔

جب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، اپنے گھر کا ماحول قدامت پرست اور مذہبی پایا۔ میں چوری چھپے فیضؔ، مخدومؔ، سردارؔ، مجروحؔ اور ساحرؔ کی شاعری سے فیض یاب ہوتا رہا۔ ان کی شاعری سے تحریک پا کر میری رگوں میں گرم لہو گردش کرنے لگا۔ اس لیے میں خود بھی میدان عمل میں کود پڑا۔ ابتدا میں تک بندی کرتا تھا لیکن بعد میں باضابطہ شاعری کرنے لگا۔ ترقی پسند شاعروں کی مجلسوں اور مشاعروں میں جانا میرا معمول بن گیا۔ میرے نام کی تقلیب ہوئی اور میں وحید الدین چودھری سے وحیدؔ بھارتی بن گیا۔

ایک روز مشاعرے کے اختتام پر صاعقہ نُصیری ہال کے باہر میرا انتظار کر رہی تھی۔ جونہی میں باہر نکلا تو وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''وحیدؔ بھارتی صاحب، میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں۔ کیا آپ مجھے اس کتاب پر اپنا آٹوگراف دے سکتے ہیں؟'' اس نے کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی۔

کتاب کو دیکھ کر میں اچنبھے میں پڑ گیا۔ میری شاعری کا پہلا مجموعہ 'آزاد لبوں سے پرے' تھا۔ میں نے اپنے تاثرات لکھ کر دستخط کر دیے۔ ''صاعقہ نُصیری کے نام..... بولنا ہی کافی نہیں، اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ ڈھیر ساری محبتوں کے ساتھ۔ وحیدؔ بھارتی'۔

اس روز کے بعد صاعقہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہنے لگی۔ بہت ہی جذباتی اور نڈر لڑکی تھی۔ گریجویشن کر کے ایم اے پولیٹکل سائنس میں داخلہ لیا تھا۔ کمیونزم نے اس کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ البتہ میں نے اسے ابتدا ہی میں آگاہ کیا کہ ''میری زندگی غریبوں اور مفلوک

الحال لوگوں کی خدمت کے لیے وقف ہو چکی ہے اور شاید زندگی میں مجھے کبھی استحکام نصیب نہیں ہوگا۔ اس لیے مجھ سے کوئی امید رکھنا بیوقوفی ہوگی''۔ لیکن اس پر تو عشق کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ میری ہزار کوشش کے باوجود وہ مجھ سے دور رہنے کو تیار نہ تھی۔ دراصل جوانی میں جو کھم اور رومانس انسان کو دیوانہ بنا دیتے ہیں۔ عاشق کی عقل پر تالے پڑ جاتے ہیں۔

صاعقہ کے قرب نے میری شخصیت میں ایک عجیب سا ٹھہراو پیدا کرلیا۔ پس آزادی اکثر رفیقوں کو اپنا گھر بساتے دیکھ کر مجھے بارہا خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی ازدواج میں بندھ جاؤں۔ اپنے سے زیادہ مجھے صاعقہ کی فکر ستا رہی تھی کیونکہ وہ عسکری تحریک سے وابستہ ہونے لگی تھی اور مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ کوئی انتہا پسند قدم نہ اٹھالے۔ وہ رفتہ رفتہ عید کا چاند ہونے لگی تھی۔

بہت عرصے کے بعد وہ مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے دل میں ٹھان لی کہ آج تو میں اپنی بات کہہ کر رہوں گا۔ مگر وہ اس دن بہت ہی طیش میں تھی۔ بیٹھتے ہی گویا ہوئی: ''وحید، میں نے نکسلی تحریک کے ساتھ جڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ تو کب سے اس تحریک کے ساتھ جڑ چکی تھی۔ شاید میرا دل رکھنے کے لیے گوش گزار کرنا چاہتی تھی۔ دراصل وہ ضرورت سے زیادہ جذباتی ، بغاوت پسند اور اشتعال پسند تھی۔ نہ جانے کس کے زیر اثر وہ طبقاتی جدوجہد کا اہم رکن بن گئی اور نکسلی مہم کے ساتھ جڑ گئی۔ اور وہ بھی زندگی کے اس موڑ پر جب میں اپنے خوابوں کی نئی تعبیریں سوچ رہا تھا۔ میرے دل میں نکسلیوں کے خلاف عجیب سی نفرت پیدا ہوگئی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو صاعقہ۔ ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہے۔ تین ریاستوں میں مارکسی کمیونسٹوں نے اقتدار سنبھالا ہے۔ جمہوری ملک ہے، بدلنے میں وقت تو لگ ہی جائے گا۔''

وہ بپھر کر بولی۔'' خاک بدل جائے گا۔ مساوات، آزادی اور اخوت کے حسین خواب......! سب کافور ہو چکے ہیں۔ گلی سڑی پیپ کی طرح بہہ رہے ہیں۔ اب تو انھیں نکاسی کے

لیے کوئی راستہ بھی نہیں مل رہا ہے۔ سارا معاشرہ متعفن ہو چکا ہے۔ جن کمیونسٹوں پر تمھیں ناز ہے... جو تمھارے رفیق کار ہیں... وہ خود سرمایہ داری کی چکا چوند میں کھو چکے ہیں۔ ان کے بچے امریکا، جرمنی اور جاپان میں جا کر بس چکے ہیں اور جو یہاں ہیں وہ صنعت کار بن چکے ہیں ۔ لاچار غریب بچے کیڑے مکوڑوں کی طرح کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں میں اپنی زیست تلاش رہے ہیں یا پھر چوراہوں پر لال بتی ہونے کا انتظار کرتے ہیں تا کہ موٹر کاروں میں سفر کرنے والے ان کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر چند سکّے ڈال سکیں۔ یہ ملک صارفی آکٹوپس کے پنجوں میں پھنس گیا ہے۔ اب کسانوں کو ہر سال کمپنیوں سے بیج خریدنے پڑتے ہیں۔ فصلوں پر دوسری کمپنیوں میں بنی ہوئی زہریلی کرم کش دواؤں کا بے تحاشہ چھڑکاو کرنا پڑتا ہے۔ یہ زہر کچھ ان کی رگوں میں اور کچھ صارفین کی رگوں میں پھیلتا جاتا ہے۔ پھر بیماریاں پھیل جاتی ہیں جن کے لیے کچھ اور کمپنیوں کی بنائی ہوئی ادویات کی ضرورت پڑتی ہے۔ شیطان کی آنت کی طرح ایک لمبا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے یہ۔ زمین سے نل اکھڑتے جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ پانی کی بوتلیں اُگ رہی ہیں۔ پانی قدرت مہیا کرتی ہے مگر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے لیبل چڑھا کر اسے بیچتی ہیں۔ جو قیمت ادا نہیں کر پاتا اسے آرسینک ملے زہریلے پانی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ہڈیاں پگھلتی رہتی ہیں۔ پھر بھی ہماری سوشلسٹ حکومتیں غریب نواز ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔"

"مگر صاعقہ تم سمجھتی کیوں نہیں یہ جمہوریت کا تقاضا ہے۔ جمہوریت میں لوگوں کی مرضی چلتی ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ بنگال ہو یا کیریلا، بہار ہو یا گجرات، حکومتیں تو لوگ چنتے ہیں۔"

"لوگوں کو بدنام نہ کرو، نئے طفیلی حکمرانوں کی بات کرو۔ چھ دہائیوں تک سوشلزم کے نام پر دیش کو لوٹتے رہے اور جب ملک کنگال ہوا تو نئے راگ الاپنے لگے۔ پہلے سوشلزم اور قومیانے کے نعرے بلند کر کے رعایا کو بیوقوف بناتے رہے اور اب کھلے بازار، سرمایہ کاری اور

پیداوار یت کی باتیں کر رہے ہیں۔ قدرتی وسائل سے جتنا نچوڑا جا سکتا تھا اتنا امیٹھ لیا۔ انسانی وسائل کی باتیں کرنے والے اب مشینوں اور کمپیوٹروں کی باتیں کر رہے ہیں۔ کسی کو اس بات کی فکر نہیں کہ آخر کب تک یہ دھرتی ہمارا بوجھ اٹھاتی رہے گی۔ کہاں تک ہماری معیشت قرضے کا اتنا بوجھ برداشت کرتی رہے گی۔ غور سے دیکھو چہرے وہی ہیں صرف چارٹر بدل گئے ہیں۔"

صاعقہ نصیری بولتی چلی جارہی تھی۔ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ "وحید، اب تو زمینوں پر فصلوں کی نہیں بلکہ بلند و بالا مکانوں کی کھیتی ہورہی ہے۔ شہروں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی، انسان مٹھی بھر دھوپ کے لیے ترستا ہے، موریاں زمین دوز ہوگئی ہیں، برسات میں شہر کے شہر ڈوب جاتے ہیں، گندے پانی کی نکاسی نہیں ہوتی، ہر طرف جوہڑ، تالاب اور ان میں پلتے مچھر دکھائی دیتے ہیں۔ جدھر دیکھو پلاسٹک اور پولی تھین کے پہاڑ جمع ہورہے ہیں۔ کرم کش دوائیاں اب اثر نہیں کرتیں۔ ہر سال نئی نئی بیماریوں کے نام سننے میں آتے ہیں۔ ملیریا، ڈینگو، چکن گونیا، ایچ ون این ون، ایڈس، ہیپاٹائٹس ...اس پر ہسپتالوں کی بدنظامی ...اور مرتے ہوئے لوگوں کے ٹھٹ۔ دھرتی پانی کے بدلے زہر اگل رہی ہے اور ہوا آکسیجن کے بدلے دمّے کی بیماری پھیلا رہی ہے۔ پھر رات کے مناظر بھی کچھ الگ نہیں ہیں وحید۔ اگلے زمانے میں طوائفیں ہوتی تھیں، بالا خانے ہوتے تھے، اب ہوٹل، ڈسکو، پارلر اور لاج ہیں۔ کالج ہیں، اسکول ہیں، یونیورسٹیاں ہیں، ہوسٹل ہیں۔ اب تو یہ منظر بھی پرانا ہوگیا ہے۔ آج کل انٹرنیٹ پر سب کچھ دستیاب ہے۔ ایسکارٹ، لڑکے، لڑکیاں، پورن اور دیگر من بہلاوے اب گھروں میں گھس آئے ہیں۔ اور اس تناظر میں مجبور اور لاچار انسان کرے تو کیا کرے؟ ہم اس کو ترقی سمجھ بیٹھے ہیں!"

صاعقہ کے تیور دیکھ کر میں نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ کچھ بھی نہ بولا۔ دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ بس اس کے ہونٹوں پر ایک لمبا سا بوسہ دے کر الوداع کہہ دیا۔

پھر اکیلے میں فکر مند ہوا۔ "ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے صاعقہ۔ آزادی کے بعد کچھ بھی تو نہ

بدلا۔ صرف حکمران بدل گئے۔ پہلے بدیشی تھے اور اب سودیشی ہیں۔ سوشلزم، کمیونزم، مساوات، عوام شاہی، طبقاتی جدوجہد۔ کھوکھلے نعرے ہوا میں تحلیل ہوتے رہے۔ سرمایہ داری ہماری رگ رگ میں بس گئی ہے جبکہ ہم ان کھوکھلے نعروں سے اپنا دل بہلا رہے ہیں اور بیوقوف بنتے جا رہے ہیں۔

انسانی جذبات اور اذیتوں کی کہانی بھی عجیب سی ہے۔ جب نکاس کے لیے جگہ نہیں ملتی تو انقلابی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر نظر آتے ہیں جنتر منتر، رام لیلا میدان اور تحریر سکوائر۔''

مجھے احساس ہوا کہ میری رگوں میں اب خون سرد پڑ چکا ہے تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں بدستور غریبوں کی بستیوں میں جا کر ان کی باز آبادکاری کے لیے کام کرتا رہا۔ ان گندی بستیوں میں آج بھی زندگی ویسی ہی ہے جیسی انگریزوں کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ ایک بار مجھے اپنے این جی او کی خاطر امداد حاصل کرنے کے لیے دہلی جانا پڑا۔ بیس سال پہلے میں اس شہر میں پہلی بار وارد ہوا تھا۔ ان دنوں جگہ جگہ غریبوں کے لیے ڈھابے ہوتے تھے، کاونٹر کے پیچھے مالک کھڑا ہوتا تھا، ساتھ ہی دو چار پیتل کے بڑے بڑے پتیلے سجے ہوتے تھے جن میں دال، سبزی، راجماش اور چاول ہوتے تھے۔ نزدیک ہی تندور میں روٹیاں سینکی جاتی تھیں۔ پوری تھالی کی قیمت ڈیڑھ روپے ہوتی تھی۔ دال اور پیاز مفت مل جاتے تھے۔ غریب سے غریب آدمی بھی شکم سیر ہو کر باہر نکلتا تھا۔ ان بیس برسوں میں نہ جانے کیا ہوا۔ ڈھابے اڑ گئے، غریبوں کی دکانیں اڑ گئیں، ان کی جگہ اونچے اونچے مال بن گئے جن کے اندر غریب لوگ قدم رکھنے سے بھی ڈر جاتے ہیں۔ اندر میک ڈونلڈ ہے، پیزا ہٹ ہے، برجر کنگ ہے اور بھی نہ جانے کس کس ملک کے طعام ہیں مگر سستی دال روٹی نہیں ملتی۔ ایسا لگتا ہے کہ ہماری نئی نسل دیسی طعام کا مزہ ہی بھول چکی ہے۔ عام لوگوں کے لیے باہر ریڑھیوں پر پاؤ باجی، چھولے کلچے، سبزی پوری اور اڈلی ڈوسا ملتا ہے جن میں ملاوٹی مصالحوں کے علاوہ سڑکوں کی دھول ملی ہوتی ہے۔ ان برسوں میں دہلی کتنی بدل چکی تھی۔ مجبور ہو کر

میں بھی ایک ریڑھی والے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور چھولے کلچے کھا کر پیٹ کی آگ بجھاتا رہا۔

رات کا ڈنر لاجپت نگر میں ایک دوست صابر محمود کے گھر میں کر لیا جو میری ہی طرح انقلابی تھا مگر زمیندار باپ کی وجہ سے جلد راہ راست پر آ گیا اور ایم اے، پی ایچ ڈی کر کے یونیورسٹی میں لکچرر ہو گیا۔ دراصل جوانی میں کئی رئیس زادے سوشلزم کی باتیں کرنے میں جوش و ہیجان سا محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ صابر محمود آج بھی دوسرے انٹلکچول لوگوں کی طرح سوشلزم پر لمبے لمبے لکچر دیتا ہے مگر اس کے گھر میں جاگیرداری کی ٹھاٹ اب بھی باقی ہے۔ ڈنر کھاتے وقت مسز صابر نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ''آپ آج جنید کے نئے سکول گئے تھے؟''

''ہاں فارم لے کر آیا ہوں۔ انھوں نے ایڈمشن فیس میں اضافہ کر لیا ہے۔ اب ڈیڑھ لاکھ دینا پڑے گا اور ماہانہ فیس بیس ہزار الگ۔''

''اس میں تو کوئی چارہ نہیں ہے۔ بچے کو اچھی تعلیم دینی ہے اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ آج کل ہر جگہ یہی ریٹ چل رہی ہے۔''

میں خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا اور فکر و تردد کے اتھاہ سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ ڈیڑھ لاکھ داخلے کے لیے اور ماہانہ بیس ہزار! ہمارے زمانے میں سرکاری سکولوں سے کتنے ہی ڈاکٹر انجینئر، سائنس دان اور دانشور نکلتے تھے اور اپنے ملک کا نام روشن کرتے تھے۔ ان سکولوں میں فیس برائے نام ہوتی تھی۔ پھر یہ سب کیا ہوا؟ یہ کونسی ترقی کر لی ہم نے؟ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔

خیر وقت کی رفتار کسی کے لیے نہیں رکتی۔ صاعقہ اور میں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ وہ بارہا انڈر گراونڈ ہو جاتی اور مہینوں اس کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا تھا۔ کہاں ہے، کیسی ہے، زندہ ہے یا مر گئی، کوئی بتا نہیں سکتا تھا۔ اس بار وہ کئی مہینوں تک غائب رہی۔ نہ جانے کہاں کہاں گھومتی رہی اور پھر ایک روز آدھی رات کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اندر سے

پوچھا۔ ''کون؟''

''صاعقہ'' دروازے کے باہر سے آواز آئی۔ میں نے جھٹ سے دروازہ کھول کر اسے اندر کھینچ لیا اور خاموش رہنے کے لیے کہا۔ ان دنوں حکومت نکسلیوں کی دھر پکڑ میں زور وشور سے مصروف تھی۔ میں نے اس کو باز رکھنے کی بہت کوشش کی تھی، کئی بار سمجھایا بھی تھا لیکن صاعقہ کے سر پر جو بھوت سوار ہو چکا تھا وہ نہ اترنا تھا اور نہ اترا۔

میں نے کمرے کی ساری کھڑکیاں بند کر لیں اور ان پر پردے ڈال دیے۔ پھر دوسرے کمرے کی بتی جلائی تاکہ ہمارے کمرے میں زیادہ اجالا نہ ہو۔ میں صاعقہ سے رازدارانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ ''صاعقہ یہاں تم کو ڈھونڈنے کے لیے کئی بار پولیس آچکی ہے۔ تم کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی ہو۔ مجھے تمھاری سخت فکر لگی رہتی ہے۔''

''کم آن، کس بات کی فکر؟ میں تو سر پر کفن باندھ کر نکلی ہوں۔ اب کیسا واپس مڑنا۔ ہمیں یہ متعفن نظام بدلنا ہے۔ بندوق کے بغیر یہ کبھی نہیں بدل سکتا۔ بنگال اور تریپورا میں تمہارے دہریہ کمیونسٹ رفیق ہر سال پوجا پنڈالوں پر کروڑوں روپے پھونکتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ہندستانیوں کے لیے کمیونزم کا مطلب صرف روٹی کپڑا اور مکان ہے اور کچھ نہیں۔ وہ اس دنیا کی بجائے دوسری دنیا میں سکون کے متمنی ہیں۔ مندر مسجد وہ چھوڑ نہیں سکتے۔ صبح اٹھ کر اذان بھی سننا چاہتے ہیں اور مندروں کی گھنٹیاں بھی بجانا چاہتے ہیں۔ ہندو کمیونسٹوں نے مارکس کو قشقہ لگایا ہے اور مسلمان کمیونسٹوں نے اس کا ختنہ کر دیا ہے۔ مرنے کے بعد بھی پرمپراؤں کا خیال رکھا جاتا ہیں۔ ہندو لاش کو جلا کر ہی مکتی مل جاتی ہے اور مسلمان لاش کو قبر ہی میں آرام مل جاتا ہے گو پوری عمر وہ الحاد کا حامی رہا ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ تمھارے دوست ثقافتی انقلاب لائیں گے۔ کبھی نہیں۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ کر سرشار ہو رہے ہیں۔''

اس رات بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے میں نے اس کو خفیہ راستے

سے بستی سے دور پہنچا دیا۔

پھر کچھ مہینے بعد کسی نے خبر دی کہ صاعقہ نے کسی اور سے دوستی کر لی ہے۔ دونوں جنگلوں میں مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ حکومت نے اس کے دوست شاہ نواز اور اس کے سر پر پچاس پچاس ہزار کا انعام رکھا ہے۔ پولیس کو میری اور صاعقہ کی دوستی کی خبر مل چکی ہے اس لیے میرے گھر پر چوبیس گھنٹے پہرہ لگا رہتا ہے۔ لیکن وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ میں ان حرکتوں میں کبھی شامل ہوا ہی نہیں۔ اس کے باوجود پولیس نے مجھے کئی بار تفتیش کے لیے تھانے پر بلایا اور صاعقہ کے بارے میں پوچھ گچھ کی مگر میں کیا بتاتا، مجھے تو اس سے ملے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ گچھ کر کے تھک گئے۔

دھیرے دھیرے پانی میرے سر سے اونچا ہو گیا۔ پولیس کی یا تنائیں بڑھتی گئیں۔ میں بہت پریشان ہو گیا۔ پیشیاں، سوالات، ایذا رسانی.....! کئی بار میرے ساتھ زیادتیاں بھی کی گئیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میرا قصور کیا ہے...؟ کیوں بار بار مجھے تھانے پر بلایا جا رہا ہے...؟ اب تو اپنے پرائے کو بھی مجھ پر شک ہونے لگا تھا۔ کوئی نکسلی سمجھتا تھا اور کوئی دیش دروہی۔ کوئی سلام کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا اور کوئی دیکھ کر کنی کاٹ لیتا۔ میں اندر ہی اندر گھلتا جا رہا تھا مگر چہرے سے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا۔

ایک روز ایک قریبی دوست سومناتھ بسواس نے مجھ سے کہا۔ ''شاعر بابو، تم کیا سمجھتے ہو کہ اپنے نام کے ساتھ 'بھارتی' جوڑنے سے تم بھارت واسی ہو گئے۔ تم نے بہت بڑی غلطی کر لی۔ تقسیم کے وقت پاکستان چلے گئے ہوتے، اس وقت نہ جانے کس بڑے عہدے پر فائز ہوتے۔ یہ لوگ تو تمھیں شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ آتنک وادی سمجھ بیٹھے ہیں۔ وحید بھارتی جی، یہ دھرتی اب تم لوگوں کو قبول نہیں کرتی۔ کمیونسٹ ہو تو کیا ہوا۔ ہو تو مسلمان ہی۔''

مجھے سومناتھ کی باتیں سن کر ایسے لگا جیسے کسی نے میرے ذہن پر کوڑے برسائے

ہوں۔ ان دنوں ہمارے علاقے میں زبردست فرقہ وارانہ فساد رونما ہوا تھا۔ پولیس کئی لوگوں کو آئی ایس آئی ایجنٹ بتا کر حراست میں لے گئی تھی۔ میں سومناتھ بسواس کو کیا جواب دیتا۔ کیسے بتاتا کہ میرے خاندان نے ہندستان کی آزادی کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں۔ خود میں نے حرص و ہوس کو کبھی آگے پھٹکنے نہیں دیا۔ میں نے کسی عہدے کے لیے جد و جہد نہیں کی تھی۔ میں نے تقسیم وطن کو نامنظور کیا تھا۔ میرا یہ ارادہ تھا کہ جس دھرتی پر پیدا ہوا ہوں اسی پر آخری سانس لوں گا۔ بہر حال میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ چند ہی دہائیوں میں ہوا کیسے بدل گئی۔ یہ سب کیا ہوا، کیسے ہوا؟ سب کچھ میری سمجھ سے باہر تھا۔ میرے اردگرد دنیا بدل چکی تھی اور میری حیثیت اب تماشائی سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ جیسے شاہ مار خزانے کے اوپر کنڈلی مار کر بیٹھا رہتا ہے ویسے ہی میں اپنے اصولوں پر کنڈلی مار کر بیٹھا رہا۔ پھر یہ سومناتھ بسواس کیا کہہ گیا؟ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔

سب کچھ بدل گیا اور میں محض تماشائی بنا رہا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔ ان سب تبدیلیوں کی شروعات کب ہوئی اور کیوں ہوئی۔ صارفی دنیا... کھلا مارکیٹ... عالمی گاؤں ...انسانیت کو دھوکا دینے کے لیے ایک مکروہ جال۔ آج کل سوشلزم اور کمیونزم کی بات کرنا گناہ ہے۔ لوگ ہنستے ہیں ان الفاظ پر۔ شکر ہے کہ میں نے بہت پہلے خاموشی اختیار کر لی ورنہ لوگوں کے مضحکے کا نشانہ بن جاتا۔

صاعقہ اور اس کے نکسلی دوست شاہ نواز کو ہفتہ بھر پہلے سیکورٹی فورسز نے پکڑ لیا۔ دو دن تفتیش کی گئی۔ دونوں کے بدن پر جلے سگریٹ مروڑے گئے۔ ہزار وولٹ برقی رو کے کرنٹ دے کر ان سے راز اگلوانے کی کوشش کی گئی۔ یخ کی سلوں پر سلایا گیا۔ صاعقہ کی چھاتیوں کو نارنگیوں کی طرح نچوڑا گیا۔ شرم گاہ میں گرم سلاخیں ڈالی گئیں۔ اس کے باوجود پولیس کے ہاتھ کچھ بھی نہ لگا۔ تین روز بعد دونوں کی مسخ شدہ لاشیں دور جنگل میں پائی گئیں۔ پولیس کا انکاونٹر اخباروں اور ٹیلی ویژن چینلوں پر تب سے چھایا ہوا ہے۔ کوئی جائز ٹھہرا رہا ہے اور کوئی ناجائز۔

مجھے نہ جانے کیوں ایک موہوم سی امید تھی کہ صاعقہ ضرور واپس آئے گی اور ہم دونوں اپنا چھوٹا سا گھر بسائیں گے۔ مگر وہ خواب چکنا چور ہو گیا۔ اب آنکھوں میں کوئی اور خواب باقی نہیں رہا۔ آنکھیں خالی خالی سی ہیں۔ ذہن بھی خالی خالی سا ہے۔ دل بھی خالی خالی سا ہے۔

دودھ کا قرض

ساری بستی شعلوں میں لپٹی ہوئی تھی۔

آگ کی لپٹوں اور دھوئیں کی اوٹ میں سے نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا لڑکا برآمد ہوا اور سنسان سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ عمر کوئی دس گیارہ برس کی تھی۔ رات بھر وہ اندھیرے کو اوڑھ کر خود کو چھپاتا رہا، پھر صبح کاذب نے اس کی امیدیں جگائیں اور وہ خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ صبح صادق اب دور نہیں۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی اور موت کی اصلی ماہیت سے وہ چند ہی گھنٹے پہلے آشنا ہو چکا تھا۔ ایک حسین خواب تھا اور دوسرا ڈراونا کابوس...!

اس کمسن لڑکے کو کہاں جانا تھا، اسے معلوم نہ تھا۔ فقط دوڑے جا رہا تھا۔ مہیب اندھیروں کو پیچھے چھوڑ کر وہ روشنی کی تلاش میں بھاگ رہا تھا۔ دل میں پہلے کی مانند ہی پھر سے سانس لینے کی آرزو لیے ہوئے! لڑکے نے ہانپتے کانپتے قریباً ایک میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ وہ دوڑتا، تھک جاتا، کچھ دیر دم لیتا، پھر اسے کچھ یاد آتا اور دوبارہ دوڑنا شروع کر دیتا۔ کچھ دیر بعد ایک نئی بستی شروع ہو گئی مگر وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا صرف بھاگتا رہا۔ پھر ناگاہ نہ جانے کیا ہوا۔ وہ سڑک پر اوندھے منہ گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

اُدھر نئی بستی میں رحمتی نیند سے جاگ کر اپنے مکان کی دوسری منزل کی کھڑکی کھول رہی تھی۔ اس کی اچٹتی نگاہ باہر سڑک پر پڑ گئی جو ابھی بھی کہرے میں ملفوف تھی۔ جونہی اس کی نظر لڑکھڑاتے ہوئے اس ننھے لڑکے پر پڑی اس کی ممتا نے کروٹ لی اور وہ کچن سے پانی کا لوٹا اٹھا

کرکودتی پھاندتی نیچے سڑک پر پہنچ گئی۔ اس نے لڑکے کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ چند ثانیوں میں وہ ہوش میں آیا۔ رحمتی نے اس کو لوٹے سے پانی پلایا اور پھر سہارا دے کر اپنے گھر کی طرف لے گئی۔

لڑکے نے عورت کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگا۔

''مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو....'' وہ برابر التجا کرتا رہا اور ساتھ ہی روتا بھی رہا۔ اس کے من میں نہ جانے کیسے کیسے اندیشے پیدا ہوتے رہے۔

''گھبراؤ نہیں بیٹے، تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔'' ممتا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ ترحم اور دردمندانہ نگاہوں سے واماندہ بچے کو دیکھنے لگی۔

لڑکا چُپ چاپ رحمتی کو دیکھتا رہا۔

''تمھارا کیا نام ہے، بیٹے؟'' رحمتی نے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر سوال کیا۔

کچھ وقفے کے لیے لڑکے کی خاموشی برقرار رہی۔ وہ من ہی من میں سوچتا رہا کہ کیا نام بتاؤں؟ لیکن پھر دل نے گواہی دی کہ یہ عورت تو سراپا ممتا کی مورت معلوم ہو رہی ہے، مجھے کوئی زک نہیں دے گی۔ یہ سوچ کر اس کے منہ سے ایکا ایکی نکل پڑا۔ ''میرا نام اقبال ریشی ہے۔''

''مسلمان ہو کیا؟''

''نہیں آنٹی، ریشی تو میری عرفیت ہے۔ پنڈتوں میں بھی ریشی ہوتے ہیں۔ پاپا اردو کے ٹیچر تھے اور علامہ اقبالؔ کو بہت پسند کرتے تھے، اس لیے انھوں نے میرا نام اقبال رکھ لیا۔''

لڑکے نے جونہی اپنے باپ کا ذکر کیا تو اس کے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

''کیوں تمھارے ابا نہیں ہیں؟'' رحمتی نے اس کا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا اور اسے گھر کے اندر لے گئی۔

اقبال تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کا ماتھا پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ اندر گھستے ہی وہ پھر سے بے ہوش ہو گیا اور فرش پر دھڑام سے گر گیا۔ بدن میں کپکپاہٹ بدستور جاری تھی۔ رحمتی جلدی سے ٹھنڈے پانی کا ایک اور لوٹا لے آئی اور اس پر چھڑکنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں وہ سنبھل گیا۔ رحمتی نے لوٹے سے گلاس میں پانی انڈیل کر اس کو اپنے ہاتھوں سے پلایا جیسے اس کی ماں کبھی کبھار پلاتی تھی۔ وہ اجنبی عورت کے چہرے کو گھورنے لگا۔ دہشت کے ماحول میں اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس کو اپنی ماں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ ایک روز اس کی ماں کی رفیق کار رابعہ ان کے گھر آئی تھی جو بالکل رحمتی کی شکل وصورت کی تھی۔ گو اس کی پوشاک ماں سے کچھ مختلف تھی مگر بول چال اور رویے میں کوئی فرق نظر نہیں آرہا تھا۔ پوچھنے پر اس کی ماں نے کہا تھا۔

''بیٹا، رابعہ میرے ساتھ سکول میں پڑھاتی ہے۔ گو ہمارے رہن سہن میں زیادہ فرق نہیں تاہم پوشاک سے ہم پہچان سکتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے یا ہندو؟ اب تو مغربی کلچر کے سبب وہ امتیاز بھی مٹتا جارہا ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ ہم مندروں میں جاتے ہیں اور یہ مسجدوں میں۔ علی الصباح ان کی عبادت گاہوں سے اذانیں گونجتی ہیں اور ہماری عبادت گاہوں سے آرتی کے میٹھے سُر سنائی دیتے ہیں۔ بیٹے، بھگوان تو ایک ہی ہے، بس پوجنے کے طریقے انیک ہیں۔''

لیکن کل رات جو کچھ ہوا اس سے اقبال کی فکر وسوچ بدل گئی تھی اور اس کے دل میں عجیب سا ڈر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دل میں انسان کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی اور انسانیت ہی سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا بیٹے۔ کیا تمھارے ابا نہیں ہیں؟''

اقبال یکبارگی دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ رحمتی احساس گناہ سے پشیماں ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی پوچھ تاچھ کے باعث لڑکا پریشان ہو رہا ہے۔ سو اس نے مزید کریدنا بند کر دیا۔ مگر کچھ وقفے کے بعد اقبال خود ہی بول اٹھا۔

''آنٹی، انھوں نے میرے ماں باپ کو مار ڈالا۔ کل آدھی رات کے قریب چار مسلح افراد ہمارے گھر میں گھس آئے۔ ان میں سے کوئی بھی کشمیری نہیں بولتا تھا۔ ایک آدمی نے پتا جی سے کہا کہ ہم رات بھر یہیں رہیں گے۔ میرے پتا جی، پریم ناتھ پریمؔ نے بنا کسی پس و پیش کے ایک کمرہ خالی کروایا اور انھیں آرام سے رہنے کو کہا۔ ماتا جی نے کھانا بنا کر پروس دیا۔ خود پتا جی، ماں اور میں دوسرے کمرے میں خوف سے سمٹ کر رہ گئے اور آنکھوں آنکھوں میں رات گزاری۔ اِدھر ایک دو گھنٹوں کے بعد ہر طرف سے پولیس گاڑیوں کے چلنے کی آوازیں، سائرن اور پھر گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ دوسرے کمرے میں چاروں افراد جل بن مچھلی کی طرح تڑپنے لگے۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ پولیس نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہوگا۔ بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے اجالا ہونے سے پہلے بھاگنے کا پلان بنایا، میرے والدین کو انسانی ڈھال بنا کر اپنے آگے آگے چلنے کو کہا کیونکہ انھیں یقین تھا کہ پولیس ان پر گولی نہیں چلائے گی۔ میں پریشان حال اوپر جا کر دوچھتی میں چھپ گیا۔ باہر رات بھر گولیاں چلتی رہیں۔ کبھی رک رک کر اور کبھی مسلسل۔ دریں اثنا چاروں طرف شور مچ گیا۔ ''آگ... آگ... آگ..!'' ساری بستی آگ کی نذر ہو رہی تھی۔ آگ سے بچنے کے لیے میں نیچے اتر آیا اور جا کر بھیڑ میں ملا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ پولیس نے مجاہدوں کو باہر نکالنے کے واسطے آگ لگائی جبکہ پولیس کہہ رہی تھی کہ دہشت گردوں نے دھوئیں کی ٹٹی بنانی چاہی تاکہ پولیس سے بچ نکلیں۔ صبح تک سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ پولیس نے دس لاشیں گاڑی میں بھر دیں جن میں وہ چار بندوق بردار اور میرے والدین بھی تھے۔ میں لاچار چھپتا چھپاتا دور سے خاموش دیکھتا رہا۔ جب ہلکی ہلکی روشنی ہونے لگی تو میں گھبرا گیا۔ سوچا کوئی پہچان نہ لے اس لیے وہاں سے بھاگ نکلا۔''

یہ سارا سانحہ معصوم اقبال کے وجود کا حصہ بن چکا تھا۔ اس کے من میں نہ صرف عسکریت پسندوں بلکہ ان کے ہم مذہبوں کے لیے عجیب سی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے مکان سے بھاگ تو

نکلا مگر یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائے بوڑھی ماں باپ کا پتہ اور وہ بھی ایسے حالات میں...! اس کے وجود میں عجیب سی اتھل پتھل مچ گئی۔ ماں کی کہی ہوئی ساری باتیں دماغ میں بازگشت کرتی رہیں۔ ''بیٹے ہم سب انسان ہیں اور ہم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کا بھگوان ایک ہے، صرف پوجا کرنے کے طریقے الگ الگ ہیں۔ ہمیں سب سے محبت کرنی چاہیے۔ حاجت مندوں کی حاجت رفع کرنی چاہیے۔ کیا معلوم کس کی صورت میں بھگوان مل جائے؟'' مگر رات بھر کے واقعات نے ان سب باتوں کو جھٹلا دیا تھا۔ وہ رحمتی کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ اب اسے ایک نئے تجربے سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ رحمتی اس کی ماں کی رفیق کار اور سہیلی رابعہ کی کاربن کاپی لگ رہی تھی اور اس کا گھر بالکل اس کے اپنے گھر جیسا لگ رہا تھا۔ رحمتی کی ممتا نے اس کے وجود کو دوبارہ سان پر چڑھایا۔

کچھ وقفے کے بعد اس نے ہمت جٹائی اور رحمتی سے کہنے لگا۔ ''آنٹی، اگر میں چھپ نہ جاتا وہ مجھے بھی مار دیتے۔''

''بیٹے، بھول جاؤ ان باتوں کو۔ یہ کچھ سر پھرے ہیں جو اس بات کو نہیں سمجھتے کہ روز قیامت کے دن ان کی جواب دہی ہوگی اور اس وقت ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ کسی دین میں معصوموں کا قتل واجب نہیں ٹھہرایا گیا ہے۔ ان تخریبی کارروائیوں سے بہتر تھا کہ تعمیری کاموں میں لگ جاتے۔ اپنے قوم اور ہم وطنوں کی بہبودی کا کام کرتے۔ مگر انھیں کون سمجھائے؟ ہوا ہی کچھ الٹی چلی ہے۔ زیادہ تر لوگ سرحد پار سے آئے ہیں۔ اپنے ملک کو تو جہنم بنا ہی چکے ہیں اب یہاں بھی ویسے ہی حالات پیدا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہاں تم سوچتے ہوگے کہ لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ غلط...! اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ جواب جاہلاں باشد خموشی۔ اس لیے وہ بے عمل ہو چکے ہیں۔'' کچھ توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ ''رہتے کہاں ہو؟''

''آنٹی اس سڑک پر بہت آگے ایک چھوٹا سا پُل ہے اس کو پار کر کے ہماری نئی بستی بنی ہوئی تھی۔''

''تمھارا کوئی رشتے دار تو ہوگا؟'' رحمتی نے اقبال کو دلاسہ دیتے ہوئے اس کے رشتے داروں کے بارے میں پوچھ لیا۔

''ہاں آنٹی، جنرل پوسٹ آفس سرینگر میں میرا ماما کام کرتا ہے۔ وہاں سیکورٹی کا پورا انتظام ہے اس لیے وہ جگہ محفوظ ہے۔ میری ایک بڑی بہن بھی ہے جس کی شادی پانچ سال پہلے چنڈی گڑھ میں ہوئی تھی۔''

''بیٹے تم فکر مت کرو۔ میرا بیٹا تمھیں تمھارے ماما کے پاس چھوڑ دے گا۔ وہاں سے تم اپنی بہن کے پاس چلے جانا۔ نہیں تو اگر چاہو تو ہم تمھیں چنڈی گڑھ پہنچانے کا انتظام کروا سکتے ہیں۔''

''نہیں آنٹی۔ بس ماما کے پاس کوئی لے جائے، کافی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔ تم مطمئن رہو۔''

رحمتی نے اپنے بیٹے سجاد کو آواز دی اور کہا، ''ہیا سجادا (اوئے سجاد)!، اس بچے کے والدین کل رات مڈبھیڑ میں مارے گئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس کو آج ہی...نہیں....ابھی... اسی وقت اپنے ماما کے پاس چھوڑ آؤ۔ ورنہ یہ ننھا منا معصوم بچہ سوچتے سوچتے کُملا جائے گا۔ پھر ہم خدا کے پاس کیا جواب دیں گے۔''

''ممّی، پہلے نہا دھولوں اور ناشتہ کرلوں، پھر اسے اپنے سکوٹر پر لے جا کر جی پی او میں چھوڑ دوں گا۔''

''نار لگے تیرے نہانے اور ناشتے کو۔ دیکھ نہیں رہا کہ یہ چھوٹا سا بچہ جب سے آیا ہے، آدھا ہو کر رہ گیا ہے۔ چلو جلدی تیار ہو جاؤ اور اسے لے جاؤ۔''

سجاد مزید کسی مزاحمت کے بغیر اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے کے لیے چلا گیا۔ اتنی دیر میں رحمتی کا شوہر مسجد سے نماز پڑھ کر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کے چار لفافے اور آدھا درجن

باقرخانیاں تھیں۔رحمتی جلدی سے اُٹھی دودھ گرم کیا اس میں کافی ساری چینی ملائی، بادام، چھوٹی

الائچی اور زعفران ڈال دیے، پھر قلعی کیے بڑے سے تانبے کے گلاس میں انڈیل دیا اور اس کے بعد اقبال کے سامنے رکھ دیا۔ ساتھ میں دو باقر خانیاں بھی رکھ دیں۔ سجاد اور اس کے والد کے سامنے دو باقر خانیاں اور چائے رکھ دی۔ وہ اقبال سے مخاطب ہوئی۔

''چومیانہ لالہ (پیو میرے لال)، ماں کے ہاتھ کا دودھ پی کر جاؤ۔ خدا تمھیں لمبی عمر اور روشن مستقبل سے نوازے۔ میں تمھارے لیے ہر دم دعائیں کرتی رہوں گی۔''

اقبال آنسو ملا دودھ چپ چاپ پیتا رہا حالانکہ اس کو کچھ بھی کھانے پینے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ ناشتہ کر کے وہ رحمتی اور اس کے شوہر کے گلے ملا اور سجاد کے سکوٹر پر بیٹھ کر جی پی او پہنچ گیا۔ وہاں پر اقبال نے جونہی اپنے ماما کو دیکھ لیا، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی۔ کچھ دیر بعد اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے ماما کو اپنی ساری رام کہانی سنائی۔ ماما نے اسے دوسرے روز جموں بھجوا دیا جہاں سے وہ چنڈی گڑھ اپنی بہن کے پاس چلا گیا۔ وہاں پر وہ بہن کے بچوں کے ساتھ ہی پلتا رہا۔

کشمیری پنڈت مہاجروں کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ انھوں نے غیر مساعد حالات میں بھی ہمت نہ ہاری۔ یہ سچ ہے کہ ایک پوری نسل تباہ و برباد ہوگئی جیسے پکی ہوئی فصل پر ٹڈی دل نے حملہ کیا ہو۔ مگر انھوں نے آنے والی نسل کی پرورش کے لیے اپنا خون پسینہ بہایا۔ خود جھلستی گرمی میں پھٹے ٹاٹ کے خیموں میں زندگی بسر کرتے رہے، ذیابیطس اور امراض قلب سے جوجھتے رہے لیکن اپنے بچوں کو پڑھایا، لکھایا اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ بہن نے نہ صرف اپنے بچوں بلکہ اپنے بھائی کی تعلیم میں خوب دلچسپی لی۔ اقبال نے بھی خوب محنت کر کے اس کی ریاضت کو چار چاند لگائے۔ بارہویں پاس کر کے گورنمنٹ میڈیکل کالج چنڈی گڑھ سے امتیازی نمبرات کے ساتھ ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی۔ چھ سال بعد پی جی آئی ایم ای آر چنڈی گڑھ میں ایم ایس کی پڑھائی

مکمل کر لی اور کچھ برس بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ چلا گیا۔ وہاں تقریباً چھ برس قیام کیا جس دوران میں اس نے سرطان کے مرض کے بارے میں سپیشلائزیشن کر لی۔ اس کے بعد وطن کی یاد ستانے لگی، اس لیے لوٹ کر دہلی کینسر سپر سپیشلٹی اسپتال میں بطور ماہر سرطان جوائن کر لیا۔

ڈاکٹر اقبال ریشی اپنے پیشے کو عبادت سمجھتا ہے۔ وہ اب بہت ہی مصروف رہتا ہے۔ اس کی چاروں جانب مریض ہی مریض نظر آتے ہیں اور وہ ان کو صحتیاب کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ ماں باپ تو بچپن ہی میں چھوٹ گئے تھے مگر اس کو ہر سن رسیدہ مریض میں اپنے والدین کی شبیہ نظر آتی ہے۔ اس کی دردمندی اور غمخواری نے اس کی شہرت چہار سو پھیلا دی۔

ایک روز ڈاکٹر اقبال کے ایک جونیئر نے اس کو ایمرجنسی وارڈ میں شتابی آنے کی درخواست کی جہاں ایک بوڑھی عورت بیڈ پر کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے جونہی مریضہ کو دیکھا تو اسے اپنی ماں یاد آ گئی۔ ماں کی دی ہوئی نصیحت اس کے کانوں میں بازگشت کرنے لگی۔

"بیٹے ہم سب انسان ہیں اور ہم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کا بھگوان ایک ہے، صرف پوجا کرنے کے طریقے الگ الگ ہیں۔ ہمیں سب سے محبت کرنی چاہیے۔ حاجت مندوں کی حاجت رفع کرنی چاہیے۔ کیا معلوم کس کی صورت میں بھگوان مل جائے؟"

ڈاکٹر مریضہ کے قریب سٹول پر بیٹھ گیا اور اس کے نرم و ملائم ہاتھوں کے لمس سے فیض یاب ہوتا رہا۔ مریضہ کو بھی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی مسیحا عرش سے اتر کر اس کی عیادت کے لیے آیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے مریضہ کا بغور معائنہ کیا، کئی ٹیسٹ کروائے اور پھر اس کو آپریشن کروانے کی صلاح دی۔ مریضہ کے بیٹے نے ہسپتال آفس سے رجوع کر کے خرچ کا تخمینہ مانگ لیا۔ اسے بتایا گیا کہ ہسپتال میں طعام و قیام اور ادویات کا خرچہ اندازاً دو لاکھ پڑے گا اور ڈاکٹر کی فیس؛ لگ سے تین لاکھ کے قریب ہوگی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بیٹے اور باپ نے آپس میں مشورہ کیا، روپے کا

انتظام کروایا اور آپریشن کروانے کے لیے راضی ہو گئے۔ انھوں نے سنا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کے ہاتھوں کو خدا نے شفا عطا کی ہے اور اس کے آپریشن اکثر کامیاب رہتے ہیں۔

دو روز کے بعد مریضہ کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا اور ڈاکٹر اقبال نے تقریباً تین گھنٹے آپریشن کر کے مریضہ کے سرطان کی رسولی نکال دی۔ آپریشن کی کامیابی کے باعث مریضہ کا شوہر اور اس کا بیٹا خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ انھوں نے کئی بار ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا حالانکہ دونوں کو اس بات کا احساس تھا کہ ابھی اصلی جھٹکا باقی ہے۔ وہ بل کا انتظار بے صبری سے کرتے رہے۔ گو انھیں تخمینہ مل چکا تھا مگر کیا معلوم اور کون کون سی چیزیں شامل کی گئی ہوں اور بل کی رقم کتنی بڑھ گئی ہو؟

پورے ایک ہفتے مریضہ ہسپتال کی میزبانی برداشت کرتی رہی اور صحتیابی کی اور قدم بڑھاتی رہی یہاں تک کہ وہ خود سے اب چلنے پھرنے لگی تھی۔ ادھر اس کے لواحقین کو خرچے کی فکر ستا رہی تھی اور وہ ہر روز ڈاکٹر سے اس کے ڈسچارج کے بارے میں پوچھتے رہے مگر ڈاکٹر تھا کہ مسکرا کر بنا کچھ کہے چل دیتا۔ آخر کار جس روز مریضہ کے ڈسچارج کا حکم ملا، دونوں باپ بیٹے دل تھام کے بیٹھ گئے۔

ہسپتال کا ایک ملازم مریضہ کے بیڈ کے پاس آیا اور اس کے شوہر کو بل تھما دیا۔ شوہر کی ایسی حالت تھی کہ وہ بل کو دیکھنے سے گھبرا رہا تھا، اس لیے بنا پڑھے جلدی سے اپنے بیٹے کو بل پکڑا دیا۔ بیٹے نے جب بل کا معائنہ کیا تو وہاں پر صرف دو لاکھ روپے واجب الادا تھے۔ اس نے بل کو الٹا پلٹا اور بار بار اس کو پڑھا کہ کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کلرک کی غلطی کی وجہ سے اس کی ماں کا ڈسچارج سستے میں ہو جائے اور پھر کلرک کو وہ سارا روپیہ اپنی جیب سے بھرنا پڑے۔ وہ حیراں بھی تھا اور پریشاں بھی۔ اس لیے ریسپشن پر جا کر معلوم کیا کہ کیا بات ہے؟ وہ ریسپشن کلرک سے مخاطب ہوا، ''میڈم، عجیب بات ہے، پوری بل ایک ساتھ کیوں نہیں دی

جارہی ہے؟ ہمیں مریضہ کو آج ہی گھر لے جانا ہے، اب ہمارے پاس وقت نہیں ہے، شام کی فلائٹ سے ٹکٹیں بُک ہیں۔"

ریسپشن کلرک کو تعجب ہوا کہ عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ بل بہت زیادہ ہے، ہم نے فلاں چیزیں استعمال نہیں کیں یا پھر فلاں چیزیں ہسپتال کو لوٹا دیں مگر یہ پہلا صارف ہے جو کہہ رہا ہے کہ بل کم کیوں ہے؟ وہ مخمصے میں پڑ گئی اور سامنے کھڑے آدمی کو مشورہ دیا کہ اندر دفتر میں جا کر منیجر سے رجوع کر لے کیونکہ انھیں ان باتوں کا سارا علم رہتا ہے۔ مریضہ کا بیٹا جلدی سے دفتر کے اندر چلا گیا اور منیجر سے جا ملا، وہاں اس نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ منیجر نے اس کا استقبال ہلکی سی مسکراہٹ سے کیا۔ پھر مریضہ کی پوری فائل الماری سے نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ فائل میں سارے کاغذات موجود تھے اور سب سے اوپر ڈاکٹر کا تین لاکھ کا بل نتھی کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس بل پر ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ سے مندرجہ ذیل عبارت رقم کی تھی۔

"ہسپتال اور ادویات کا جو بھی خرچہ ہو، وہ مریضہ سے وصول کر لیا جائے۔ جہاں تک ڈاکٹر کی فیس کی رقم کا تعلق ہے وہ پینتیس سال پہلے ایک دودھ کے گلاس کی شکل میں وصول ہو چکی ہے۔ میں رحمتی کی صحتیابی کی دعا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر اقبال ریشی"

رحمتی کا بیٹا سجاد ہکا بکا رہ گیا۔ وہ دم بخود منیجر اور بل کو دیکھتا رہا۔ اس کو اس صبح کا منظر یاد آیا جب وہ ایک چھوٹے سے لڑکے کو سکوٹر پر جی پی او تک چھوڑ آیا تھا۔

پھر دل نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنا تو فرض بنتا ہے، اس لیے منیجر سے پوچھ بیٹھا۔ "ڈاکٹر صاحب کہاں ملیں گے؟"

منیجر صاحب نے لاتعلقی سے جواب دیا۔ "ڈاکٹر صاحب کچھ گھنٹے پہلے کسی ضروری کام سے امریکہ روانہ ہو چکے ہیں۔"

☆☆☆☆☆

ہرکارہ

تپتی ہوئی سرمئی سڑک پر وہ اپنی سائیکل گھسیٹے جارہا تھا مگر ٹانگیں ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ سارا بدن جلتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ سانس بھی پھول چکی تھی۔ پھر بھی وہ منزل تک پہنچنے کی لگاتار کوشش کر رہا تھا۔ آسمان سے شعلے برس رہے تھے۔ لوگ کئی دنوں سے مون سون کا انتظار کر رہے تھے مگر بادلوں کا کہیں دور دور تک نام ونشان بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جون کا مہینہ ختم ہونے کو آیا تھا۔ بارش کی ایک بوند بھی کہیں گری نہ تھی۔ جدھر نظر ڈالو وہاں سوکھا پڑا تھا۔ اُدھر محکمہ موسمیات سے مایوس کن خبریں سننے کو مل رہی تھیں کہ مون سون آنے میں ابھی دیر ہے۔

اسے گاؤں کی فکر ستا رہی تھی۔ وہاں اس کی بوڑھی ماں، ایک بہن اور دو بھائی تھے۔ ایک بھائی عمر میں اسے بڑا اور شادی شدہ تھا۔ بہن کی شادی کی چنتا سب کو لگی ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ نہ جانے گھر کا کیا حال ہوا ہوگا۔ ابھی تو پچھلے سال کا قرض بھی نہیں اترا کہ یہ نئی مصیبت آن پڑی۔ فصلیں تباہ ہو چکی ہوں گی۔ ڈھور ڈنگر پانی کے لیے ترس رہے ہوں گے۔ ان کے لیے چارہ بھی نہیں ملتا ہوگا۔ اسے کئی برس پہلے پڑا ہوا سوکھا یاد آیا جب زمین پر ہر سو دراڑیں ہی دراڑیں نظر آ رہی تھیں اور کہیں کوئی گھاس کا پتا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دہقان اپنے کھیتوں کو دیکھ کر تلملا رہے تھے۔ ایک طرف قرض داروں کا تقاضا اور دوسری طرف پاپڑ بنے ہوئے کھیت۔ کئی کسانوں کی خود کشی کے سبب سارے گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔

گوسائیں داس نے دسویں تک تعلیم حاصل کی تھی اور پھر اپنے ہی گھر میں برانچ پوسٹ ماسٹر کا کام سنبھالا تھا۔ وہ ڈاک ٹکٹیں، لفافے ، پوسٹ کارڈ وغیرہ بیچا کرتا اور کبھی کبھار رجسٹری اور

منی آرڈر بک کرلیتا۔ گاؤں کے لوگ بچت بنک سے روپے نکالنے یا جمع کرنے کے لیے اس کے پاس چلے آتے۔ یہ سب کام وہ آسانی سے کرلیتا اور وہ بھی اپنے ہی چھت کے نیچے۔ گوسائیں داس اپنی مرضی کا مالک تھا پھر بھی وہ دن نہیں بھول پا رہا تھا جب اس کے ماموں نے ڈاک خانے کے انسپکٹر سے اس کی ملازمت کی بات کی تھی اور بیس ہزار کی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ انسپکٹر نے گاؤں میں ڈاک خانہ کھولنے کی تجویز پیش کی، اس کی منظوری کے لیے تگ وتاز کی اور پھر گوسائیں داس کو غیر محکمانہ برانچ پوسٹ ماسٹر لگا دیا۔ ساتھ میں ایک اور آدمی کو تین ملحق گاؤں میں ڈاک تقسیم کرنے کے واسطے ڈیلوری ایجنٹ مقرر کردیا۔ ملازمت حاصل کرنے کے لیے اس کے والد کو بیس ہزار کا قرض اٹھانا پڑا تھا۔ ایک دُودھیل گائے تھی اسے بیچ کر کچھ قرضہ اتار دیا مگر شومئی قسمت اُسی سال سوکھا پڑ گیا۔ گھر میں بدحالی نے ڈیرا ڈال دیا۔ گھر کی خستہ حالت دیکھ کر اور سامنے بیٹی کی اٹھتی جوانی دیکھ کر والد کی ہمت ٹوٹ گئی اور اس نے خودکشی کرلی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی ساری رقم دے کر بھی نوکری سرکاری نہ تھی بلکہ غیر سرکاری تھی۔ اس وقت تو خیر تنخواہ کچھ حد تک معقول تھی ورنہ دو عشرے پہلے صرف ایک سو دس روپے ماہوار مل جاتے تھے کیونکہ ڈاک خانے کا یہ کام فاضل وسیلۂ روزگار مانا جاتا تھا، بنیادی نہیں۔ بہر حال محنت کش بی پی ایم بچت بنک میں جمع کی گئی رقم سے بطور کمیشن خاصی کمائی کرلیتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور امید کی کرن تھی۔ اور وہ تھی کہ اگر بندہ مستقبل میں کبھی محکمے کا امتحان پاس کرلیتا تو سرکاری ملازمت پا سکتا تھا۔ وہ چاہے پوسٹ مین کی نوکری ہو یا پھر گروپ ڈی کی۔ اس طرح معقول تنخواہ مل سکتی تھی، بونس مل سکتا تھا اور سبکدوشی پر پنشن بھی مل سکتی تھی۔ علاوہ ازیں سرکاری چھٹیاں، میڈیکل اخراجات، ایل ٹی سی اور ڈھیر ساری مراعات حاصل ہو سکتی تھیں۔ یہی ایک امید ہے جو ہزاروں لاکھوں غریب دیہی نوجوانوں کو ڈاک خانے سے جوڑ لیتی ہے اور وہ عمر بھر اس کی آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ چند ایک کامیاب ہو کر اپنا مستقبل سنوار لیتے ہیں جبکہ اکثر و بیشتر

پوری عمر اکسٹرا کا لیبل لگائے اس دنیا سے کوچ کرجاتے ہیں۔ نہ امتحان میں کامیابی ملتی ہے اور نہ ہی سینیارٹی کے بل بوتے پر تقرری ہوتی ہے۔ امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے محض سند یافتہ ہونا یا پھر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا کافی نہیں ہوتا۔ کیریئر کے رتھ کو آگے بڑھانے کے لیے ہر مرحلے پر روپے کے پہیئے لگانے پڑتے ہیں۔ گوسائیں داس نے دس سال کی نوکری میں اتنا تو سیکھ لیا تھا۔ اس کے نصیب نے اس کا ساتھ دیا۔ ایک بار دہلی سے یونین کا جنرل سیکریٹری اس کے گاؤں آیا۔ اس نے لیڈر کی خوب خاطر مدارات کی۔ دستر خوان جام اور مرغ سے سج گیا۔ نتیجتاً اس نے یونین لیڈر کا دل جیت لیا۔ اس کے توسل سے کامیابی کے راستے کھل گئے، سرکل آفس کے افسروں کی جیبیں گرم ہوگئیں اور ایک بار پھر بیس ہزار کی دکھشنا دے کر گوسائیں داس ہرکارہ بن گیا۔

گوسائیں داس کو گماں بھی نہ تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ بیس ہزار کی چپت تو لگ چکی تھی مگر اصلی جھٹکا تب لگا جب اس کو شہر میں تعیناتی کا حکم مل گیا کیونکہ گاؤں میں پوسٹ مین کی تقرری ممکن نہ تھی۔ انجام کار گھر چھوٹ گیا، ماں بھائی بہن سب چھوٹ گئے، اور اب شہر میں ایک حبس زدہ کمرے میں دن گزارنے کی نوبت آئی۔ کئی بار جی میں آئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس چلا جائے مگر پھر چالیس ہزار اور اس گائے کی یاد آتی جس کو بیچ کر یہ نوکری نصیب ہوئی تھی۔ یہ سوچ کر دل میں اٹھا طوفان تھم جاتا۔ دو چار مہینوں کے بعد گھر جانے کی فرصت ملتی مگر وہاں کی پراگندگی دیکھ کر دل مایوس ہو جاتا۔ گاؤں والوں کا کیا انھیں تو گوسائیں داس کسی بڑے بابو سے کم نہیں لگتا تھا۔ اس کی جھلک پاتے ہی سب لوگ گھروں سے باہر نکل آتے اور اس کو گھیر لیتے۔ ماں، بھائی بندھو سب اس کو دیکھ کر خوش ہو جاتے اور اس سے تحائف کا تقاضا کرتے۔ وہ کسی کو نہیں بھولتا تھا۔ سب کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے آتا۔

شہر میں صبح سویرے جب وہ دفتر کے لیے نکل جاتا ایک خوبصورت لڑکی اس کا راستہ کاٹ لیتی تھی۔ کوئی کالی بلی تو تھی نہیں کہ سائیکل پر سے اتر کر تھوڑی دیر رک جاتا اور پھر سفر جاری

رکھتا۔ وہ پہلے پہل اسے نظر انداز کرنے لگا مگر ایسا کہاں تک ممکن تھا۔ آخر کار ایک روز اس لڑکی نے شرارت بھرے لہجے میں پکارا۔ ''بابو، میری چٹھی پتری تو نہیں آئی ہے۔ کب سے کوئی پتر ہی نہیں ملا۔''

گوسائیں داس نے مڑ کر لڑکی کو دیکھا اور گویا ہوا۔ ''کس کی چٹھی کا انتظار ہے؟ کوئی رشتے دار کہیں باہر گام گیا ہے کیا؟''

''ہاں یوں ہی سمجھ لو بابو۔ کب سے انتظار میں بیٹھی ہوں۔'' لڑکی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر اور تھوڑا انتظار کرلو۔ شاید آجائے۔ اپنا نام بتا دو، آگے سے خیال رکھوں گا۔''

''ہرکارہ بابو، دیکھ لینا، کوئی خط برکھا رانی کے نام آجائے تو دے دینا۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

گوسائیں داس پھر بھی اس کا مطلب سمجھ نہیں پایا لیکن من میں چاہت کی چنگاری پیدا ہوگئی۔ سوچنے لگا کہ کون ہوسکتا ہے جس کے خط کا انتظار برکھا رانی کو ہے؟ گاؤں میں ایسا کون ہے جس کے ساتھ اس کی آشنائی ہوسکتی ہے؟ سنا ہے کہ ڈاکیے خط کو دیکھ کر ہی اس کا مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ بنا کھولے بتا سکتے ہیں کہ اندر کیا لکھا ہے، خوشخبری ہے یا کوئی منحوس پیغام! مگر یہاں تو الٹا ہی معاملہ تھا۔ یہاں تو قیافہ شناسی کا امتحان لیا جارہا تھا۔

دوسرے روز برکھا رانی نے پھر اس کا راستہ روک لیا۔ دیکھتے ہی بولی۔ ''کیوں رے، بابو، کوئی خط آیا یا نہیں۔'' اور پھر کئی روز یوں ہی گزرتے رہے۔ نہ خط آیا نہ برکھا کے من کی پیاس بجھی۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ ہر روز وہی سوال کرتی اور وہی جواب پاتی۔ گوسائیں داس کو چڑ سی ہونے لگی۔ ایک روز تنگ آکر جواب دیا۔ ''اری برکھا، میں کیا کروں، تمھیں کوئی خط لکھتا ہی نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور۔ جب خط آئے گا تو خود ہی دے دوں گا۔ یہ روز روز کیوں پوچھتی

ہو۔''

برکھارانی آج بہت ہی شاداں وفرحاں لگ رہی تھی۔ مسخرے پن سے بولی۔''بابو، کوئی نہیں لکھتا تو کیا ہوا، تم ہی لکھ دو۔'' اس کے ساتھ ہی وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور دوڑتے ہوئے گلی میں غائب ہوگئی۔

آج پہلی بار گوسائیں داس کو کچھ کچھ سمجھ میں آیا۔ گھر جاتے ہی اس نے مکان مالکن سے، جس کو وہ اماں کہتا تھا، اس بارے میں پوچھ لیا۔ اماں سن کر ہنس دی اور کہنے لگی۔''مورکھ ابھی تک نہیں سمجھے۔ وہ تمھیں چاہتی ہے۔ اس کو کسی کے خط کا انتظار نہیں ہے۔ وہ تو بس تمھارے ساتھ پریم کرنے لگی ہے۔ کل جب ملو گے تو ہاں یا ناں میں جواب دے دینا۔''

بوڑھی اماں کا تجربہ کام کر گیا۔ گوسائیں نے اپنے من کی بات کہہ دی اور برکھارانی کو ایسا لگا جیسے اس کے سوکھے وجود پر ابر دریا بار چھا گیا۔ وہ پھولی نہ سمائی۔ اور پھر یہ سلسلہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ دونوں کبھی آم کے باغوں کی سیر اور کبھی دریا کے کنارے گھنٹوں ٹہلتے رہتے۔ برکھارانی کے نشے میں گوسائیں گاؤں کو بھول ہی گیا۔ شہر میں خرچہ اتنا بڑھ گیا کہ گاؤں روپے بھیجنا بند کر دیا۔ وہاں سے مسلسل تقاضا ہوتا رہا اور یہاں سے طویل خاموشی چھا گئی۔ ماں پریشان، بھائی پریشان، بہن پریشان، خط پر خط لکھے جا رہے ہیں لیکن گوسائیں کسی کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ بڑے بھائی نے سب کام چھوڑ چھاڑ کر شہر کی راہ لی اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ گوسائیں داس بھلا چنگا ہے مگر اس کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ بہت پوچھنے پر بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ آخر کار اماں نے راز فاش کر دیا اور بڑے بھائی کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ گوسائیں کسی لڑکی کے قابو میں آ گیا ہے اور تب سے عجیب عجیب سی حرکتیں کر رہا ہے۔ اب نہ اس کے دن کا پتا چلتا ہے اور نہ رات کا۔ بہتر ہوگا کہ ان دونوں کی شادی کی جائے۔ اتنا سننا تھا کہ بڑے بھائی نے رات کو ڈنر کے وقت گوسائیں داس سے سب کچھ پوچھ لیا اور اگلے ہی روز لڑکی کے گھر پہنچ گیا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ لڑکی کے گھر جا کر

اسے بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بیٹھتے ہی اس کی ذات پوچھی گئی اور جب اس نے اپنی ذات کے بارے میں بتایا تو جواب ملا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ ہم کھشتری ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ہمارا حال آج کل کچھ پتلا سا ہے مگر اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم اپنی لڑکی کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کو دیں گے۔ ہماری ڈیوڑھی پر ایک زمانے میں ہن برستا تھا۔ دادا جی گاؤں کے مکھیا تھے۔ جوئے اور شراب میں ساری جائیداد گروی رکھ دی اور ہمیں سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ مگر کہتے ہیں نا کہ ہاتھی ہزار لٹے تو بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ہماری لڑکی تو بڑے گھر ہی بیاہی جائے گی۔ ہمیں سمجھ نہیں آرہا ہے کہ آپ نے یہاں آنے کی ہمت کیسے کی۔''

واپس آکر بڑے بھائی نے گوسائیں داس کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ سمجھا۔ وہ کسی اور جگہ شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ نصیب اچھا تھا کہ اس کی پٹائی نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کے نام کی سپاری دی گئی ورنہ ان لوگوں کی رگوں میں ٹھاکروں کا خون دوڑ رہا تھا اور وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے۔ گوسائیں اور برکھا دونوں تڑپ کر رہ گئے۔ برکھا پر تو اب پہرے لگ چکے تھے۔ ملنے کی کوئی سبیل نہیں بن رہی تھی۔

اِدھر گوسائیں کی صحت گرتی چلی گئی۔ کئی بار بیمار ہوا۔ ڈاکٹر نے جانچ کی مگر معلوم ہوا صرف ذہنی پریشانی اور جسمانی کمزوری ہے۔ ڈیوٹی تو خیر کرنا ہی پڑتی ہے۔ وہ چاہے جھلستی گرمی ہو، ٹھٹھرتی سردی ہو، موسلا دار بارش ہو، بازار میں پتھراؤ ہو، بستی میں بم پھٹ رہے ہوں یا پھر سڑک پر لاٹھی چارج ہو رہا ہو۔ ڈاک تقسیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب صبح سویرے برکھا کے بدلے بلی راستہ کاٹ کر جاتی ہے۔ دن بھر منحوسیت کا عالم رہتا ہے۔

آج گوسائیں کو کئی محلوں میں ڈاک تقسیم کرنے جانا تھا۔ ڈاک کا بڑا سا تھیلا اٹھا کر اس نے سائیکل کے پیچھے کیریئر میں باندھ لیا اور رام کا نام لے کر دن کے سفر پر چل پڑا۔ اس کا دائرۂ گشت ڈاک خانے سے کافی دور تھا۔ راستے میں ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا خالی میدان پڑتا تھا۔ دائیں

بائیں ایستادہ سبھی درخت سڑک بناتے وقت کاٹے گئے تھے اور اب خال خال ہی کہیں سایہ دار شجر

دکھائی دیتا تھا۔ مسافر کہیں دم لینا بھی چاہتا تو کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جہاں پر وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر سستاتا۔ سڑک کے اختتام پر گوسائیں کو برساتی نالے پر بنا ہوا پُل پار کرنا پڑتا۔ تب وہ کہیں جا کر دوسری طرف بسے گاؤں میں پہنچ جاتا اور وہاں دکانوں اور گھروں میں ڈاک تقسیم کر لیتا۔ شدید گرمی کی وجہ سے اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آس پاس کہیں پانی کی بوند بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اگر نالے میں اس وقت پانی ہوتا تو وہ اسے ہی پی لیتا۔ اس کے سوکھے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ بدن پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ سارا جسم تپ رہا تھا۔ وہ کہیں چھاؤں میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں سائیکل چلانے کی قوت باقی نہیں بچی تھی۔ پھر بھی وہ سائیکل کو اس امید کے ساتھ گھسیٹے جا رہا تھا کہ آگے کہیں نہ کہیں بستی ملے گی اور وہ اپنی پیاس بجھا سکے گا۔ جیسے تیسے اس نے پُل پار کر لیا اور سامنے بستی نظر آنے لگی۔ دیکھ کر تھوڑا بہت اطمینان تو ہوا لیکن اسے ابھی بھی یقین نہ تھا کہ وہ منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہوگا۔

آخر کار وہ ایک دکان کے پاس پہنچ گیا اور اس کے ہاتھ سے سائیکل چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ اس نے دکان دار کی جانب دیکھ کر کہا۔ ''بھیا، ذرا مجھے پانی پلا دو۔'' اس کے ساتھ ہی وہ نڈھال ہو کر دکان کے تھڑے پر گر پڑا۔ دکان دار اسے دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا۔ جلدی سے تھوڑی سی مٹھائی اور پانی لے کر آیا اور اسے پلا دیا۔ پھر گوسائیں کو بانہوں میں اٹھا کر دکان کے اندر لایا۔ تب تک اور بھی کئی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ گوسائیں کا بدن تپ رہا تھا۔ پانی پلانے کے باوجود اسے ہوش نہیں آ رہا تھا۔ دکان دار نے سب کچھ یونہی چھوڑ چھاڑ کر اپنا رائیل این فیلڈ سٹارٹ کیا۔ ایک اور آدمی نے گوسائیں کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر اسے زور سے پکڑ لیا۔ اور موٹر سائیکل فراٹے بھرتی ہوئی ہسپتال پہنچ گئی۔

سائیکل اور ڈاک کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ گیا۔ جاتا بھی کیسے۔ یہاں گوسائیں کی جان پر بن آئی تھی پھر ان چیزوں کی طرف کون دھیان دیتا۔ سبھی لوگ اس کو بچانے کی کوشش میں جٹے ہوئے تھے اور اس کے آگے پیچھے منڈلا رہے تھے۔

اُدھر تین چار گھنٹے بعد پوسٹ ماسٹر کو اس حادثے کی خبر مل گئی۔ اس نے میل اوور سیر کو سائیکل اور غیر تقسیم شدہ ڈاک واپس لانے کا حکم دیا۔ سائیکل تو ملی مگر وہ تھیلا جس میں ڈاک تھی کتوں نے اس کی تکا بوٹی کر دی تھی اور ساری چٹھیاں وہیں زمین پر بکھیر دی تھیں۔ کچھ ثابت تھیں اور کچھ پھٹی ہوئیں۔

گوسائیں داس کو ہوش آنے میں کافی وقت لگا۔ آخر کار جب آنکھیں کھلیں تو اسے تعجب ہوا کہ وہ ہسپتال کیسے پہنچ گیا۔ اس کے گھر والوں کو بھی خبر چلی گئی تھی اور وہ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی ہسپتال پہنچ چکے تھے۔ گھر والوں کو دیکھ کر گوسائیں داس اور بھی زیادہ پریشاں ہو گیا۔

اس رات موسم بھی بدل گیا۔ باہر جم کر برسات ہونے لگی۔ کب سے گاؤں والے برکھا کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی مرادیں پوری ہو گئی مگر گوسائیں کی تشنگی پھر بھی برقرار تھی۔ اس کی برکھا اب تک نہیں آئی تھی۔ وہ من ہی من میں سوچنے لگا کہ نہ جانے اسے خبر ملی بھی ہوگی یا نہیں۔

کئی دن یوں ہی بیت گئے۔ گوسائیں داس نے دوبارہ دفتر جانا شروع کر دیا۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی اس کی پیشی لگ گئی۔ پوسٹ ماسٹر نے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا۔ ''تم کو اپنی ڈیوٹی کا ذرا بھر بھی خیال نہیں رہتا ہے۔ معلوم ہے اس روز تمھاری ڈاک میں سے ایک انشورڈ آرٹیکل اور ایک رجسٹری گم ہو چکی ہے۔ اس بارے میں شکایت بھی درج ہو چکی ہے۔ شاید محکمے کو ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا اور اس کی بھرپائی تمھاری تنخواہ سے ہوگی۔''

''صاحب جی، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو سبھی چیزیں بڑے احتیاط سے سائیکل پر رکھی تھیں۔ گرمی کے سبب میری بہت بری حالت ہو گئی تھی اور میں بے ہوش ہو کر گر گیا

تھا۔''

''تمھیں محکمے کے قائدے قانون کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ تقسیم کے لیے دی گئی ڈاک کی رکھوالی کرنا تمھاری ڈیوٹی ہے۔ تمھارا فرض تھا کہ ان چیزوں کی جان سے بھی زیادہ رکھوالی کرتے۔ انھیں پہلے کسی کے حوالے کرنا چاہیے تھا اور تب ہسپتال جانا چاہیے تھا۔ میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں سننا چاہتا۔''

چند ہی روز کے بعد اس کے ہاتھ میں سپرانٹنڈنٹ صاحب کا جاری کردہ چارج شیٹ تھا۔

اب میں وہاں نہیں رہتا

ڈاکیہ تین بار اس ایڈرس پر مجھے ڈھونڈنے گیا تھا لیکن تینوں بار مایوس ہو کر لوٹ آیا۔
اس نے دروازے پر کئی بار دستک دی تھی، بلند آواز میں میرا نام پکارا تھا اور پھر دائیں بائیں دیکھ لیا تھا کہ شاید کوئی پڑوسی آواز سن کر گھر سے باہر نکل آئے اور اسے بتلا دے کہ میں گھر میں موجود ہوں یا نہیں اور اگر نہیں ہوں تو کہاں مل سکتا ہوں۔ مگر کوئی پڑوسی نہ گھر سے باہر نکلا اور نہ ہی کسی نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔

شاید اڑوس پڑوس کے سبھی گھر خالی تھے۔ سارا محلّہ قبرستان کی مانند سنسان پڑا تھا۔ کہاں تو ہر نکڑ پر بے شمار کُتے مل جاتے تھے جو گھروں سے پھینکے ہوئے ٹکڑوں پر پلتے تھے اور کہاں یہ منظر کہ کہیں کوئی کتا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جیسے سبھی کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

میرے مکان سے ٹپکتی ہوئی غمزدہ خاموشی دیکھ کر وہ ہر بار بوجھل قدموں سے واپس مڑ جاتا۔ ایک زمانہ تھا کہ سردی اور گرمی کی چھٹیوں میں بس صدر دروازے پر دستک دینے کی ضرورت تھی کہ دروازے کے دونوں پٹ کھل جاتے اور وہ مجھے اپنا منتظر پاتا۔ اس کو میرا نام لینے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ دستک سن کر ہی میں سمجھ جاتا کہ ڈاکیہ آیا ہوگا۔ پھر دونوں برآمدے میں بید کی کرسیوں پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتے اور بہت دیر تک باتیں کرتے۔ وہ طرح طرح کی کہانیاں سناتا۔ عطر چھڑکے لفافوں کی، خون سے لکھے ایڈریسوں کی، منی آرڈر پاتی بیواؤں کی، برسوں بعد لکھے بیٹے کے خطوں کی اور خدا کے نام لکھی گئی چھٹیوں کی۔ ایک عجیب بے نام سا رشتہ تھا ہم دونوں کے درمیان۔ باقی دنوں میں کالج جانے کے سبب گھر پر نہیں ملتا پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی

آنکھیں مجھ کو ڈھونڈتی رہتیں۔ میرے خاندان کا کوئی فرد صدر دروازہ کھول کر کہہ دیتا۔ ''وہ آج یہاں پر نہیں ہے۔ کالج چلا گیا ہے۔ آپ اس کی چٹھیاں مجھے دے دیجیے۔'' مانگنے والا اگر گھر میں آیا کوئی مہمان ہوتا تو ہم دونوں کے بیچ کا رشتہ بھی بتلا دیتا۔ دراصل ڈاکیہ میرے رشتے داروں سے مانوس ہو چکا تھا اور ان کو میری ڈاک سونپنے میں سنکوچ نہیں کرتا تھا لیکن غیر شناسا چہرہ سامنے پا کر کچھ ہچکچاہٹ ضرور ہوتی۔ یہ میری ہی ہدایت کا اثر تھا کہ وہ میری ڈاک کسی ایرے غیرے کو نہیں دیتا تھا۔ بہت ایمان دار اور فرض شناس ڈاکیہ تھا۔ یوں بھی دیانت داری اور بھروسے کے اعتبار سے ڈاکیے بے نظیر ہوتے ہیں۔ خط کو دیکھتے ہی مضمون کا اندازہ لگاتے ہیں۔ عطر بیز خط کو مسکراہٹ کے ساتھ تھما دیتے ہیں جبکہ بری خبر والے خط کو انگارے کی مانند اپنے ہاتھ سے جھٹک دیتے ہیں۔

مگر اب.....! اب تو میں وہاں نہیں رہتا۔ میں کہاں رہتا ہوں مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ میرے اپنے جہاں لے جاتے ہیں، چلا جاتا ہوں۔ نئی جگہیں، نئے شہر، نئے ممالک.....! طالب علمی کے زمانے میں ان جگہوں کے نام سنا کرتا تھا مگر وہاں جانے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

چار منزلہ لکھوری اینٹوں کا میرا ڈھنڈار مکان، جس کے در و دیوار سے سوندھی سوندھی مٹی اور دیودار کی خوشبو آتی تھی، خاموشی سے ڈاکیے کو تکتا مگر کوئی جواب نہیں دے پاتا۔ دیتا بھی کیسے؟ اسے کیا معلوم تھا کہ میں کہاں رہتا ہوں؟ جس وقت میں اس کو چھوڑ کر گیا تھا سارا مکان اندھیروں میں ملفوف تھا۔ اندھیرا........ گھٹا ٹوپ اندھیرا..........! ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ پھر اس کو میرے جانے کی خبر کیسے ہوتی؟ خود اندھیروں میں گھرا ہوا دوسروں کی خبر گیری کیسے کر سکتا ہے؟ اس روز میں ڈرا سہما، پراسرار خاموشی میں ڈوبا ہوا گھر کا سارا سامان ٹرک میں لاد کر نم آنکھوں سے اپنے مکان سے رخصت ہوا تھا۔ ویسے ہی جیسے گہری نیند میں سو رہے آدمی کی روح پرواز کر جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ میری اور اس کی آخری ملاقات ہے۔ اس دن کے بعد گھر کا ذرّہ ذرّہ مجھے ڈھونڈتا رہا۔

کتنا سمے بیت گیا ہوگا۔ مجھے کچھ یاد نہیں میرے لیے تو وقت اسی لمحے تھم چکا تھا جب میں نے اپنی جائے پیدائش کو خیر باد کہا تھا اور پھر در بدر پھرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وقت بھی کتنا ظالم ہوتا ہے، اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کی فکر نہیں کرتا۔ کون مرتا ہے اور کون جیتا ہے، کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ البتہ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو انسانوں کو بے گھر کر کے یہ سوچتے ہیں کہ یہ خدا کی خوشنودی کے لیے کیا جا رہا ہے۔ مجھے اس خدا کو دیکھنے کا بڑا ارمان ہے جو خود ہی تخلیق کیے ہوئے انسان کو تباہ و برباد، بے گھر و بے بس کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ کتنا بڑا ایذا رساں ہوگا وہ خدا جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کی تکلیف و درد سے محظوظ ہوتا ہوگا۔

یہ الگ بات ہے کہ میری زندگی کی گھڑی بند ہو چکی ہے یا پھر مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ پھر بھی کہیں کچھ احساس ابھی باقی ہے جو مجھے ہر روز تاکید کرتا ہے کہ "تم زندہ ہو"۔ میرے ساتھ جو لوگ رہتے تھے وہ سب بکھر چکے ہیں۔ ہم ایک دو روز میں کہیں نہ کہیں مل ہی جایا کرتے تھے مگر اب تو برس ہا برس تک ہم مل نہیں پاتے۔ کوئی دنیا کے ایک کونے میں جا بسا ہے اور کوئی دوسرے کونے میں۔ بہت برس ہو گئے میں نے کسی کو اپنا ہم راز نہیں بنایا۔ سبھی نے اپنی زندگی کے خالی پن کو دور کرنے کے لیے نئے وضع قطع اپنائے ہیں۔ پھرن کے اندر کانگڑی اٹھائے برف سے ڈھکی سڑکوں کو ناپنے کے بجائے اب وہ ٹی شرٹ اور جینز میں سمندری ساحلوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ امریکا میں مجسمۂ آزادی کے نیچے، فرانس میں آئی فل ٹاور کے اندر یا پھر مصر کے اہرام کے پاس سیلفی لیتے نظر آتے ہیں اور دوسرے روز فیس بک پر پوسٹ کرتے ہیں۔ دیکھنے والے حسرت اور جلن سے سوچتے ہیں کہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں جو دنیا کے خوبصورت مقامات کی سیر کر رہے ہیں۔ کہاں تو کنویں کے مینڈک بنے پھرتے تھے، شہر سے باہر کی دنیا سے نابلد تھے اور کہاں تو یہ بے فکر و بے مدام سیاحت، نہ اپنی خبر اور نہ دنیا و مافیہا کی۔ البتہ کسی کو کیا معلوم کہ فیس بک پر چڑھائی گئی یہ تصویریں جھوٹ بول رہی ہیں۔ یہ سبھی پراگندہ زندگی کو بھولنے کی ناکام کوششیں ہیں۔

تصویریں دیکھنے والے اندر کے گھاؤ کہاں دیکھ پاتے ہیں۔ کوئی کسی کے زخم کرید کر تھوڑی ہی دیکھتا ہے۔ میں ان تصویروں کے اندر پل رہی بے بسی، تڑپ اور تنہائی کو محسوس کر سکتا ہوں۔

مصنوعی چہرے، مصنوعی ہنسی اور مصنوعی ٹھاٹ۔ اجنبی ساحل، اجنبی دھرتی اور اجنبی ممالک.....!

گھر میں تھے تو فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ کبھی راشن گھاٹ سے راشن لانا، کبھی گھاسلیٹ کی خاطر قطار باندھے گھنٹوں کھڑے رہنا، کبھی دکانوں کی بھیڑ سے جوجھنا۔ نانبائی کی دکان، قصائی کی دکان، کنجڑے کی دکان، ادویات کی دکان، غرض ضروریات زندگی کی لمبی چوڑی فہرست اور اتنی ہی دکانیں۔ ہر جگہ قطاریں ہی قطاریں۔ طلب ہی طلب اور رسد کہیں نظر ہی نہیں آتی تھی۔

اب تو فراوانی ہے سب چیزوں کی مگر چین نہیں ہے۔ کوئی بے چینی دل کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ سب کچھ دستیاب ہے اور وہ بھی گھر بیٹھے۔ ہوم ڈیلیوری۔ کبھی امیزون، کبھی فلپ کارٹ اور کبھی سنیپ ڈیل۔ بس آرڈر کرنے کی دیر ہے کہ سامان گھر پر کوریئر دے کر جاتا ہے۔ کوریئر....! نہ وردی اور نہ وقت پر دستک۔ وقت بے وقت کبھی بھی چلا آتا ہے اور سامان دے کر چلا جاتا ہے۔ موبائل بل، گیس بل، کتابوں کا پارسل، گفٹ پارسل۔ اور بھی بہت کچھ۔ مگر خط نہیں...!

اب خط نہیں آتے۔ وہ خون کو سیاہی بنا کر لکھے گئے خط، وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے خط، وہ آہوں اور اشکوں سے بھرے خط، وہ محبتوں اور نفرتوں بھرے خط، وہ برہ کے گیتوں سے بھرے خط، وہ انتظار کے خط، وہ وصل یار کے خط۔ وہ خط اب نہیں آتے۔ نہ میرے پاس اور نہ ہی میرے بال بچوں کے پاس۔

آئیں گے بھی کیونکر؟ عشق فرمانے کے لیے موبائیل جو ہیں۔ خط کے بدلے ای میل جو ہیں۔ تصویریں بھیجنے کے لیے وہاٹز اَپ جو ہے۔ پھر خط کے لیے کون انتظار کرے۔

اور مجھے اب خط لکھے گا بھی کون؟ یہ سچ ہے کہ ہماری نسل کو اب بھی خط ملنے کی آرزو رہتی ہے۔ خط پڑھنے میں جو مزہ آتا ہے وہ ای میل میں کہاں۔ مگر اب تو سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ اب میں وہاں نہیں رہتا۔ اور پھر میں نے انھیں اپنا نیا ایڈریس بھی تو نہیں بتایا ہے؟

کیسے بتاؤں کہ میں کہاں رہتا ہوں؟ مجھے میرے بال بچوں نے بانٹ لیا ہے۔ کبھی بڑے بیٹے کے پاس تین چار مہینے گزار لیتا ہوں، کبھی منجھلے بیٹے کے پاس اور کبھی چھوٹے کے پاس۔ ایک عجیب سا ان کہا سمجھوتا ہو گیا ہے ان کے درمیان۔ یہی تین چار مہینے کا! کبھی کبھار بیٹی اپنے پاس بلاتی ہے جب اس کے ساس سسر اپنی بیٹی کے ہاں کچھ مہینے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ بچپن میں میں نے زندگی اور موت کے درمیان تناسخ کے بارے میں سنا تھا لیکن اب اس دنیاوی آواگون کا تجربہ بھی ہو گیا۔ شاید فطرت کے اصول کے عین مطابق ہے یہ۔ موسم بھی تین مہینوں میں بدل جاتے ہیں۔ یکسانیت ہوتی تو کتنی اکتاہٹ ہو جاتی۔ زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے تغیر بہت ضروری ہے۔ یک رنگی تو کھانے کو دوڑتی ہے۔

گذشتہ سال میں نے طے کر لیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے اپنے آبائی وطن جاؤں گا اور مرنے سے پہلے اپنے چھوڑے ہوئے مکان کو نظر بھر دیکھ لوں گا۔ سو میں نے بیٹے سے درخواست کی اور ہم سب چلے گئے۔

شہر میں سب لوگ ہمیں ٹورسٹ سمجھنے لگے ہیں۔ کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ ہم وہاں کے بسکین ہیں، سیاح نہیں۔ کوئی ہمیں پہچانتا بھی نہیں۔ پچیس سالوں میں ایک پوری نسل بدل چکی ہے۔ شاید ہمارے وقت کے لوگ اب نہ رہے ہوں یا پھر بڑھاپے کے باعث گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے ہوں۔

اسی لمحے جب میں اپنے پرانے مکان کے پاس چہل قدمی کر رہا تھا، پیچھے سے کوئی مانوس سی آواز آئی۔ ''صاحب.... صاحب.... ارے صاحب آپ یہاں کیسے؟''

میں اس کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خضاب

لگی ڈاڑھی تھی۔ آنکھوں پر موٹی فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے جن کو ڈھکنے کے لیے بھیڑ کی کھال کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کینسر کے آپریشن کے سبب چہرہ بالکل مسخ ہو چکا تھا مگر پھر بھی کچھ کچھ مانوس سا لگ رہا تھا۔ میں اس کو پہچان نہیں پایا اور بلا جھجک اعتراف کیا۔ ''بھائی صاحب، معاف کرنا، میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔''

''وہ ہلکی سی ہنسی ہنس کر میری بات ٹال گیا اور پھر کہنے لگا۔ ''صاحب کیسے پہچانو گے تم۔ بہت عرصہ جو ہوا۔ میں آپ کا ڈاکیہ ہوا کرتا تھا۔ محلے میں ایک آپ ہی تھے جس کی ڈاک کم و بیش روزانہ آیا کرتی تھی اور آپ چھٹیوں کے دنوں میں روزانہ میرا انتظار کرتے تھے۔''

''اوہ تم......! میرے ذہن نے اس کے چہرے کی از سر نو تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ اس کی صورت کو دوبارہ جوڑ کر اکٹھا کرنے لگا اور کچھ ہی ثانیوں میں وہی پرانی شبیہ میری آنکھوں کے سامنے ابھر آئی۔

''بھائی، سچ مانو تو میں تمھیں پہچان ہی نہ پایا۔ تمھاری تو شکل و صورت ہی بدل چکی ہے۔''

''صاحب، کیسے پہچانتے۔ اب تو میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ریٹائر بھی۔ اس سے بھی بڑھ کر میرے گلے میں کینسر ہو چکا تھا جس کے سبب آپریشن کرنا پڑا۔ تب سے میرا حلیہ ہی بگڑ گیا ہے۔ اور پھر وقفہ بھی تو بہت ہو چکا ہے۔ خیر یہ بتائیے کہ آپ کہاں رہتے ہیں آج کل؟

''بھائی تم سے کیا چھپانا۔ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ میں کہیں بھی نہیں رہتا۔ خانہ بدوش بن چکا ہوں۔ اپنی زمین جب ٹھکراتی ہے اور مسکن جب کھو جاتا ہے تو آدمی خانہ بدوش ہو جاتا ہے۔ وہ پھر کہیں کا نہیں کہلاتا۔''

''اتنے برسوں کے بعد یہاں آنے کی کیسے سوجھی صاحب؟''

"بس یاد ستانے لگی۔ اپنی جڑوں کی یاد۔ سوچا چلو اپنی جڑوں کی کھوج میں نکل جاؤں۔ مگر یہاں مایوسی ہاتھ لگی۔ جڑیں تو سب کی سب اکھڑ چکی ہیں۔"

"صاحب، آپ کے جانے کے بعد میں کئی روز آپ کی ڈاک لے کر آپ کے گھر پر جاتا رہا۔ وہی ریڈرس ڈائجسٹ، بیسویں صدی، تحریک، کتاب...اور بھی نہ جانے کون کون سے میگزین ہوتے تھے......مگر دیتا کس کو؟ مکان میں تو تالا لگا ہوا تھا۔ کوئی یہ بھی نہیں بتا پا رہا تھا کہ آپ کا نیا ایڈریس کیا ہے ورنہ وہیں ری ڈائریکٹ کر کے بھجوا دیتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو وہ میگزین جان سے بھی پیارے تھے۔ آپ انھیں پڑھتے نہیں بلکہ چاٹ جاتے تھے۔"

"بھئی، کن میگزینوں کی بات کر رہے ہو۔ تم نے جتنے بھی نام لیے وہ سب کے سب نابود ہو چکے ہیں۔ وہ بھی وقت کے تھپیڑوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ایک ایک کر کے بند ہو گئے۔ اب تو وہ نام سننے کو بھی نہیں ملتے۔ اب ان کی جگہ نئے رسالے نکلتے ہیں لیکن وہ بات کہاں۔ رہی بات میرے ایڈریس کی، میں تمھیں اپنا ایڈریس کیسے بتا دیتا۔ کوئی موقع ہی نہ ملا۔ سرکاری کرفیو...سول کرفیو.....بند.....ہڑتال....اور پھر مجھے تو رات کے اندھیرے میں غائب ہونا پڑا تھا۔"

"پوسٹ ماسٹر کے نام ہی کوئی خط لکھا ہوتا تو ہم آپ کے نئے ایڈریس پر بھجوا دیتے۔ بہت دنوں تک آپ کے کئی دوستوں کے خط آتے رہے۔ اور وہ....عطر میں ڈوبے ہوئے خط بھی دو تین آئے تھے.....! میں نے سبھی ڈاک خانے میں جمع کروا دیے اور وہاں سے وہ ریٹرن لیٹر آفس چلے گئے۔"

"وہ میرا ماضی تھا بھائی! بھول چکا ہوں میں اپنے ماضی کو۔ وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ کون کہاں لڑھک جائے کسی کو پتا نہیں۔"

"صاحب، آپ کا وہ ایک دوست تھا نا جو آپ کے ساتھ اکثر دکھائی دیتا تھا۔ وہ...کیا نام تھا اس کا......؟ میں تو بھول ہی گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ وہی پروفیسر صاحب۔ معلوم ہے وہ

بہت عرصہ پہلے مر گیا۔ صاحب اس کا جواں بیٹا چوک میں مارا گیا۔''

''پروفیسر کا بیٹا مر گیا! مجھے تو معلوم ہی نہیں۔ وہ کیسے؟''

''اس روز کسی لیڈر نے ہڑتال کا اعلان کیا تھا۔ لوگوں نے موبائیل سے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرلیا اور نوہٹہ میں جمع ہونے کی تلقین کی۔ شہر کی تمام دکانیں بند رہیں۔ پھر شہر کے پائیں علاقے سے جلوس نکلا جو رفتہ رفتہ لال چوک تک پہنچ گیا۔ جلوس میں اکثر و بیشتر نوجوان تھے۔ ہاتھوں میں طرح طرح کے جھنڈے لیے ہوئے۔ فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے۔ سامنے سے پولیس آئی اور جلوس کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر پہلے غرائے، پھر محاذ آرائی پر اتر آئے۔ ہجوم میں جس کو جہاں کوئی پتھر یا اینٹ مل گئی پولیس پر پھینک دی۔ پولیس اپنے بچاؤ کے لیے حفاظتی ساز وسامان سے لیس تھی۔ تاہم برستے پتھر دیکھ کر ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا، انھوں نے جواب میں لاٹھی چارج کیا اور بھیڑ پر آنسو گیس کے گولے داغ دیے۔ ہر طرف آنسو رلانے والی گیس پھیل گئی اور مجمع تتر بتر ہوتا گیا لیکن ساتھ ہی مشتعل بھی ہو گیا۔ بھیڑ میں کسی نے موقعے کا فائدہ اٹھا کر پولیس کی جانب ہینڈ گرنیڈ پھینک دیا۔ پھر کیا تھا۔ جوابی کارروائی میں پولیس نے بندوقیں سنبھالیں اور دھڑا دھڑ گولیاں برسائیں۔''

''گولیاں! یہ تو زیادتی ہے۔ انھیں پہلے ہوا میں فائر کرنا چاہیے تھا۔''

''صاحب جب حالات بے قابو ہو جاتے ہیں اور معاملہ برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو قائدے قانون دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ پولیس نے براہ راست احتجاج کر رہے نوجوانوں کو نشانہ بنالیا۔ چار پانچ تو وہیں پر ڈھیر ہو گئے جبکہ پندرہ بیس زخمی ہو کر ہسپتال پہنچائے گئے۔ انھی میں پروفیسر صاحب کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔ اس نے تو سڑک پر ہی دم توڑ دیا۔ پروفیسر صاحب لاش کو دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ اس دن کے بعد کھانا پینا سب کچھ ترک کر دیا۔ رات دن بس عبادت میں جٹا رہا۔ مہینے بھر کے بعد بیوی اور تین لڑکیوں کو چھوڑ کر رحمت حق ہو گیا۔ اس روز مجھے

آپ کی بہت یاد آئی۔ پروفیسر صاحب آپ کو دیکھنے کے لیے ترستا تھا۔ میں نے کئی بار اس کو آپ کے مکان کے سامنے کھڑا پایا۔ وہ مکان کو یونہی ٹکرٹکر دیکھتا رہتا تھا۔ چونکہ اس کی گویائی چلی گئی تھی اس لیے مجھے دیکھ کر صرف گھورتا رہتا، جیسے کہہ رہا ہو، ''بھائی کس لیے اس گھر کا طواف کر رہے ہو۔ اب وہ یہاں نہیں رہتا۔ وہ اب واپس کبھی نہیں آئے گا۔ اب تو ہماری ملاقات اوپر ہی ہوگی۔''

پھر ڈاکیہ ہاتھ ملا کر چلا گیا اور نہ جانے کن گلیوں میں کھو گیا۔ میں اکیلا اس مانوس اجنبی سڑک پر اس کو دیر تک دیکھتا رہا۔ تبھی میرے بیٹے نے پکارا۔ ''پاپا، دیر ہو رہی ہے۔ ہوٹل جانا ہے، سامان پیک کرنا ہے اور پھر ائیر پورٹ بھی پہنچنا ہے۔ تین بجے کی فلائیٹ سے واپس جانا ہے۔''

میں تو بھول ہی گیا تھا کہ مجھے واپس بھی جانا ہے کیونکہ یہ گلی کوچے، یہ بازار، یہ دُکانیں، فضا میں تحلیل یہ بُو اور یہ شور شرابہ سب کچھ اپنا سا لگ رہا تھا۔ میں پل بھر ہی میں ان میں کھوسا گیا تھا اور وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ مجھے اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ مجھے واپس سفر کرنا ہے اور اجنبی دیس میں باقی ماندہ سانسیں گنی ہیں۔ بس اسی طرح جیسے اس رنگ و بو کی دنیا میں انسان کھو کر واپسی کے سفر کی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اسے بھی خیال نہیں رہتا کہ اس کو کبھی واپس جانا ہے۔

کچھ دیر میں ہم دونوں واپس ہوٹل اور پھر ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں ہوائی جہاز ایک گھنٹہ لیٹ تھا۔

اور میں ......نہیں ہم سب اس وقت کا انتظار کرتے رہے جب واپس جانے کے لیے اڑان بھری جائے گی۔ واپسی کا سفر اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا کہ اس سفر کا انتظار!

☆☆☆☆☆

ایک معصوم کی المناک موت

بہت پرانا واقعہ ہے جو میرے ذہن پر اس دن سے سوار ہے جس دن یہ وقوع پذیر ہوا تھا۔کئی بار اس سانحہ نے میرے ذہن پر دستک دی۔ ''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے قرطاس پر ضرور اتاروگے پھر بھی اب تک ٹال مٹول کرتے رہے۔''

البتہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس حادثے کو کئی بار قلم بند کرنے کی شعوری کوشش کی مگر جب بھی ہاتھ میں قلم اٹھاتا ہوں سارا وجود لرز جاتا ہے۔کچھ مہیب سے سائے میرے دل ودماغ کا احاطہ کرتے ہیں۔آنکھیں یکایک بند ہوجاتی ہیں اور ایک ننھی منی پیاری سی بچی بانہیں پھیلا کر میرے سامنے ظاہر ہوجاتی ہے۔وہ مدد کے لیے چیختی ہے، چلاّتی ہے اور پھر بے بس ہوکر خاموش ہوجاتی ہے۔وہ زبان سے کچھ بولنے کی مسلسل کوشش کرتی ہے مگر خوف ووحشت کے باعث بول نہیں پاتی ۔میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آتا ہے اور انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔قلم آگے بڑھنے سے انکار کرتا ہے اور خود بخود رک جاتا ہے۔میں قلم کو اپنی جگہ پر رکھنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہوں اور پھر خیالوں میں گم ہوجاتا ہوں۔

میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا ہے۔کئی بار ہی کیوں، بیسیوں بار ہوا ہے۔دن میں، رات میں، جاگتے ہوئے، سوتے ہوئے....کوئی میرے ذہن پر دستک دے کر مجھے پکارتا ہے، ''اٹھو کہانی لکھو...اٹھو....بہت دیر ہوگئی...اب تو لکھ ڈالو۔''

میں اٹھتا ہوں، ہاتھ میں قلم اور کاغذ اٹھاتا ہوں۔لیکن یکایک وہی کپکپن ...وہی لرزش... وہی تھرتھراہٹ محسوس کرتا ہوں اور پھر قلم میز پر رکھ دیتا ہوں۔اب تک میں نے ایک سو سے زائد

کہانیاں رقم کی ہیں لیکن ایسی کیفیت سے کبھی دو چار نہیں ہوا۔

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ مجھے وہ واردات پھر یاد آئی ہے جو مجھے بار بار تڑپاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کو قلمبند کر کے ہی دم لوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ نیند آہستہ آہستہ آنکھوں سے غائب ہوتی جا رہی ہے۔ میں بستر ہی میں اٹھ بیٹھا ہوں اور کہانی لکھنے لگا ہوں۔

اس کو شاید کہانی کہنا غلط ہوگا۔ یہ ایک سچّا واقعہ ہے جو برسوں پہلے پیش آیا تھا۔ میں ان دنوں بریلی میں تعینات تھا۔ میری بیوی ایک مقامی سکول میں پڑھاتی تھی۔ صبح سویرے اخبار پڑھنے لگا تو ایک نہایت ہی دل خراش خبر پر آنکھ ٹھہر گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بیوی کو آواز دی اور اس خبر کے بارے میں پوچھ لیا مگر اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ البتہ اس روز وہ سکول سے جلدی واپس آئی اور جونہی میں آفس سے لوٹا تو ایسے مخاطب ہوئی جیسے میرا ہی انتظار کر رہی ہو۔ ”آپ نے صبح جس خبر کے بارے میں پوچھا تھا، سکول میں دن بھر صرف اسی کا چرچا ہوتا رہا۔ پرنسپل نے آدھی چھٹی کے بعد ہی سکول بند کرنے کا حکم دیا۔“

پھر اس نے سارا واقعہ بیان کیا۔ کچھ معلومات تو مجھے پہلے ہی اخبار سے معلوم ہو چکی تھیں ۔اس لیے دونوں بیانات کا موازنہ اور تقابل کر کے سارے ماجرے کا تصوراتی خاکہ کھینچ لیا۔

میری آنکھوں کے سامنے بلیو بیلز سیکنڈری سکول کی چوتھی جماعت کا بڑا سا کمرہ نمودار ہوا ۔ڈیسکوں کے پیچھے چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر سفید بلاؤز اور نیلی سکرٹ میں ملبوس پریوں ایسی نرم و نازک لڑکیاں براجمان تھیں ۔ چوٹیاں بندھی ہوئیں ، کسی کی دو اور کسی کی ایک ، ہنستی کھیلتی معصوم بچّیاں ، بالکل گلاب کی کلیوں جیسی ، خوبصورت اور بے ریا۔ سبھی لڑکیاں چڑیوں کی مانند چہچہا رہی تھیں ۔شور و غل اتنا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پھر ایک دم ہر طرف خاموشی سی چھا گئی ۔لڑکیوں کے لب سل گئے اور وہ اپنی وردی کو ٹھیک ٹھاک کر کے کرسیوں پر تن کر بیٹھ گئیں۔

سامنے دروازے سے ایک فربہ اندام رعب دار چہرے مہرے والی، ساڑی میں ملبوس، بال جوڑے میں گندھے ہوئے، آنکھوں پر ایک بڑی سی عینک چڑھائے، ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک لگائے، ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے ہاتھ میں چند کاپیاں لیے، تیس پینتیس سال کی عورت اندر آئی۔ یکا یک جماعت کی ساری لڑکیاں کھڑی ہوگئیں اور پھر آرڈر ملتے ہی واپس اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ استانی کا نام مالتی تو مرتھا اور وہ ایک نو دولتیے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بی اے بی ایڈ پاس کرکے والدین نے مقابلے کا نو دولتیا گھر ڈھونڈ کر اس کی شادی کرلی تھی۔ سسرال میں ساس سسر اور نند دیور تھے۔ سبھی نے اس کو آنکھوں پر بٹھا دیا تھا۔ گھر میں ایک کے بدلے دو نوکر تھے اور ڈرائیور الگ۔ نوکر گھر کا کام کرلیتا اور نوکرانی دو بچوں کو سنبھال لیتی۔ پھر ساس بھی تو تھی جس نے گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ مالتی کو بچوں کے بڑھنے کا احساس ہوا نہ تجربہ۔ چند مہینے دودھ پلایا پھر اشرافی ماؤں کی طرح وہی لیکٹوجن اور سیری لیک ڈِبے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

کچھ برس گزرنے کے بعد مالتی کے بدن میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ بوریت سی محسوس کرنے لگی۔ شام کو کٹی پارٹیوں میں جایا تو کرتی تھی مگر وہاں سبھی سہیلیوں سے یہی سننے کو ملتا تھا کہ عورت کو گھر میں قید نہیں ہونا چاہیے، دن میں کوئی کام کرنا چاہیے۔ موجودہ زمانے میں عورت کسی کی غلام نہیں ہے، اسے اپنے ڈھنگ سے جینے کا پورا پورا حق ہے۔ پانی کی بوند بوند گرنے سے تو پتھر پر بھی نشان پڑ جاتا ہے۔ آخر کار مالتی نے فیصلہ کرلیا کہ تفریح کے لیے ہی سہی، وہ کسی سکول میں ضرور نوکری کرلے گی۔ اثر و رسوخ تو تھا ہی، اِدھر دماغ میں خیال آیا، اُدھر بلیو بیل سکول کے انتظامیہ نے جوائن کرنے کی دعوت دی۔ سکول میں بھی وہ اپنی ہی دنیا میں مست رہتی تھی۔ بچے تو بس اس کے لیے کھلونے تھے، ان کے ساتھ کچھ گھنٹے کھیل لیتی اور پھر واپس اپنے گھر۔

اس دن کا وہ آخری پیریڈ تھا۔ دوسرے روز سے چار دن کے لیے سکول بند ہونے والا

تھا۔ سنیچر، اتوار اور دو چھٹیاں! چھٹیوں کا کیا، ہندستان میں ہر روز کوئی نہ کوئی تیوہار منایا جاتا ہے۔ مالتی نے طالبات کے ماہانہ ٹیسٹ کی کاپیاں لوٹا دیں اور جن طالبات کے بہت کم نمبر آئے تھے ان کی سرزنش کی۔ نیہا نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔ نوٹ بک پر کچھ لکھا ہی نہ تھا۔ مالتی اسے بہت ناراض ہوگئی۔ پہلے کھڑے ہونے کو کہا۔ نیہا کھڑی ہوگئی۔ پھر اسے سوال پوچھا۔ ''نالج کے سپیلنگ بتاؤ؟''

نیہا چپ چاپ کھڑی رہی اور کچھ بھی نہ بولی۔ اس نے آج بھی سبق یاد نہیں کیا تھا۔ کرتی بھی کیسے؟ ٹیسٹ سے ایک روز پہلے دادی گھر پر باتھ روم میں نہاتے نہاتے گر پڑی تھی اور اس کی داہنی ٹانگ ٹوٹ گئی تھا۔ وہ کراہ رہی تھی۔ والدین اسے فوراً اسپتال لے گئے جب کہ پریشان نیہا اکیلی ہمسائے کے گھر میں پڑی رہی۔ کچھ پڑھ ہی نہیں پائی۔ پھر سکول کا کام کرنے میں ماں اس کی رہنمائی کرتی تھی مگر وہ تو رات بھر اسپتال میں رہی۔ دادی اب بھی پلستر باندھے ہسپتال میں پڑی ہوئی ہے۔

ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی نیہا۔ بڑے نازوں میں پلی ہوئی۔ والدین نے کتنے خواب سنجوئے تھے اپنی بیٹی کے لیے۔ حالانکہ متوسط طبقے کی اڑانیں محدود ہوتی ہیں۔ بیٹی اچھی تعلیم پائے، اچھی نوکری کرے اور پھر اچھے گھر میں بیاہ کر کے چلی جائے۔ اس سے آگے تو وہ کبھی سوچتے بھی نہیں۔ انھی خوابوں کی تعبیر کے لیے انھوں نے بڑے جتن کر کے اس کو شہر کے اس نامور سکول میں داخل کروایا تھا۔ داخلے کے وقت وہ محض پانچ سال کی بچی تھی۔ انٹرویو ہوا۔ اسے اپنا اور والدین کا نام پوچھا گیا اور اس نے توتلی زبان میں پھٹ سے جواب دیا تھا۔ والدین سے بھی کئی سوالات پوچھے گئے جیسے ان کا ہی داخلہ ہونے والا ہو۔ بے چاروں نے جوں توں کر کے سوالوں کے جواب دیے۔ پھر فیس اور تعمیری فنڈ کی طلب ہوئی۔ کُل ملا کر تیس ہزار آفس میں جمع کیے۔ کچھ دنوں کے بعد نیہا کا ایڈمشن ہوا اور والدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ نیہا کو سکول بھیجنے میں جو خرچہ برداشت

کرنا پڑ رہا تھا اس کے لیے والدین کو اپنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ سب ضروری اور غیر ضروری اخراجات میں کٹوتی ہونے لگی۔ یہ سلسلہ چار سال تک یونہی چلتا رہا اور نیہا چوتھی جماعت تک پہنچ گئی۔ روپیہ پانی کی طرح بہہ تو رہا تھا لیکن تسلی اس بات کی تھی کہ سال کی اخیر میں سند مل جاتی تھی جس میں لکھا ہوتا تھا کہ نیہا امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئی ہے۔

''اچھا، ٹیچر کے سپیلنگ بتاؤ۔'' معلمہ نے اپنی آواز کو اور زیادہ بھاری اور کرخت بنا کر پوچھ لیا۔

نیہا پھر بھی خاموش اپنی ٹیچر کو دیکھتی رہی اور اس کے منہ سے کوئی لفظ بھی نکل نہیں پا رہا تھا۔

مالتی تومر کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ ویسے ہی جھلائی ہوئی تھی۔ صبح گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنے پتی کو سکول سے گھر لے جانے کے لیے کہا تھا مگر اس نے منع کیا۔ شام کو ریل گاڑی سے ڈیرہ دون جانا تھا۔ ٹکٹیں بک ہو چکی تھیں۔ وہاں سے مسوری جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ ابھی اسے گھر جانا تھا، پیکنگ کرنی تھی، بچوں کو تیار کرنا تھا اور پھر شام کو چھ بجے ریلوے سٹیشن پہنچنا تھا۔ ویسے بھی آخری پیریڈ تھا اور اسے گھر جانے کی ہمیشہ جلدی پڑی رہتی تھی۔ نیہا کی مسلسل چُپّی نے اس کے ذہن کو مختل کر دیا۔ مالتی نے اس معصوم بچی کو پھٹکارتے ہوئے کہا۔ ''لاسٹ رو میں چلی جاؤ اور دیوار کی طرف منہ کر کے وہاں بینچ پر کھڑی ہو جاؤ۔ جب تک میں نہ کہوں گی، نیچے نہیں اترنا۔''

نیہا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر امڈ آیا۔ مارے خوف کے وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ چپ چاپ اپنی قطار سے باہر نکل کر آخری بینچ پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی اور دیوار کی طرف اپنا منہ کر لیا۔

مالتی تومر نیا سبق پڑھانے میں منہمک ہو گئی۔ قریب تیس منٹ کے بعد سکول کی آخری گھنٹی بج گئی اور ساری لڑکیاں کمرے سے یوں دوڑتی ہوئی باہر نکل گئیں جیسے کسی جیل خانے سے

قیدی چھوٹ گئے ہوں۔ مالتی کو ان سے بھی زیادہ تعجیل تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا پرس اٹھایا اور طالبات سے پہلے کمرے سے باہر چلی گئی۔ کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی کو نیہا کی طرف دھیان گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا سکول خالی ہو گیا۔ نیہا کلاس کے آخری بنچ پر دیوار کی طرف منہ کر کے خاموش ایسے کھڑی رہی جیسے ڈوروتھی براؤن ہیمانز کی نظم میں کسابلانکا جلتے ہوئے عرشہ جہاز پر کھڑا رہا تھا۔ اس کو اتنا تو احساس ہو رہا تھا کہ سارا کلاس خالی ہوتا جا رہا ہے مگر وہ مڑنے یا بنچ سے اترنے سے ڈر رہی تھی کہ کہیں ٹیچر اور ناراض نہ ہو جائے اور سزا بڑھا دے۔

کچھ دیر کے بعد سکول کا چوکیدار کمروں کے دروازے بند کرنے کے لیے گشت لگانے لگا۔ چنانچہ کمروں کی کھڑکیاں رات بھر کھلی رہتی تھیں اس لیے اس کو کمرے کے اندر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بس کمرے کے دروازے پر پہنچ جاتا، دونوں پٹ بند کر دیتا اور پھر باہر سے کنڈی لگا دیتا۔ صرف پرنسپل کے کمرے اور سائنس لیبارٹری کی پوری طرح سے چیکنگ کر لیتا۔ چوکیدار اس کمرے کے پاس پہنچ گیا جہاں نیہا سزا بھگت رہی تھی۔ چنانچہ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اس لیے اس نے دروازہ بھیڑ کر باہر سے کنڈی لگا دی۔

آہستہ آہستہ کلاس روم میں اندھیرا بڑھتا گیا اور نیہا گھبرانے لگی۔ تھوڑی بہت چاندنی کی روشنی چھن چھن کر کمرے میں اب بھی آ رہی تھی۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ زیادہ دیر بنچ پر کھڑی نہ رہ سکی۔ وہ رونے لگی۔ زار و قطار رونے لگی۔ مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ سارا سکول خالی ہو چکا تھا۔ چوکیدار ہاتھ میں ڈنڈا لیے نیچے بہت دور مین گیٹ پر سٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اگلے چار دن سکول بند تھا۔

معصوم نیہا نے ہاتھ میں چاک اٹھایا اور کرسی پر چڑھ کر بلیک بورڈ پر ہندی میں لکھنے لگی۔

''ممی... ممی... مجھے ڈر لگ رہا ہے!''

''پاپا... پاپا... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے!''

''سوری میڈم... سوری میڈم... اب میں پاٹھ یاد کر کے آیا کروں گی... میڈم مجھے معاف کردو... سوری میڈم... سوری میڈم... میں کل سے کبھی بنا پاٹھ یاد کیے نہیں آؤں گی... سوری میڈم... سوری میڈم... سوری میڈم.... مجھے گھر جانے دو... میڈم مجھے گھر جانا ہے... میڈم مجھے ڈر لگ رہا ہے.... سوری میڈم... سوری میڈم.....!''

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس چھوٹی سی بچی کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے اور اس کے بدن میں جھرجھری دوڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے بدستور آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی۔

''ممی مجھے بچاؤ.... پاپا مجھے یہاں سے لے جاؤ۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پاپا۔ آپ کہاں ہو؟''

''پاپا، جلدی آجاؤ....!''

وہ بلیک بورڈ پر تب تک لکھتی رہی جب تک پورا بلیک بورڈ اس کی لکھی ہوئی عبارت سے بھر نہ گیا۔ اب بلیک بورڈ پر کہیں کچھ بھی لکھنے کے لیے جگہ نہ تھی۔

کچھ دیر بعد اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ نیہا تھک ہار کر وہیں فرش پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔

اُدھر گھر میں ماں باپ دونوں پریشان ہوئے کہ نیہا سکول سے واپس کیوں نہیں آئی؟ جس رکشا پر وہ گھر لوٹتی تھی اس سے رابطہ کیا مگر رکشا والے نے بتایا کہ بٹیا تو میرے ساتھ واپس گھر نہیں آئی۔ میں نے بہت دیر تک اس کا انتظار کیا۔ پھر میں نے سوچا شاید آپ لوگ خود ہی اس کو گھر لے گئے ہوں۔ سکول میں دریافت کرنے گئے تو چوکیدار نے بتایا کہ سارے بچے کب کے چلے گئے۔ پرنسپل سے رابطہ کیا تو اس نے بھی کورا سا جواب دیا کہ سارے بچے چھٹی ہونے کے ساتھ ہی چلے جاتے ہیں۔ کوئی سکول میں کیسے رہ سکتا ہے اور پھر رہے گا بھی کیوں؟ کسی کے وہم و

گماں میں بھی نہ تھا کہ وہ معصوم بچی سکول میں سزا کاٹ رہی ہے۔

جس معلّمہ نے سزا سنائی تھی وہ خود مسوری کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ والدین کو سزا کے بارے میں کسی نے بتایا بھی نہیں۔ ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ مایوس ہو کر والدین نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ انھوں نے آشواسن دیا کہ وہ جلدی ہی بچی کا پتا لگائیں گے۔ تھانے دار نے ماں باپ سے طرح طرح کے سوالات پوچھے تاکہ کوئی سراغ مل جائے مگر وہاں نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ پھر کہنے لگے آپ گھبرائے نہیں ہم ایک دو روز میں اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ بہت ممکن ہے کسی نے کچھ لالچ دے کر اغوا کر لیا ہو۔ علاوہ ازیں انھوں نے والدین کو خبردار رہنے کو کہا کہ اگر کسی کا فون آتا ہے یا فروتی کی مانگ ہوتی ہے تو پولیس کو ضرور خبر کر دیں۔

والدین گھر جا کر ٹیلی فون کے پاس یوں بیٹھ گئے جیسے ابھی گھنٹی بجنے والی ہو۔ کبھی کبھار ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو دونوں چیتے کی طرح اس پر لپکتے۔ پھر نراش ہو کر واپس اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔

اُدھر نیہا بے ہوش ہو کر فرش پر کیا گر پڑی کہ پھر کبھی نہیں اٹھی۔ چار روز پڑے پڑے اس کا بدن اینٹھ گیا تھا۔ سارے جسم کا رنگ کچھ عجیب خاکستری سا ہو گیا تھا۔ اس کی بند مٹھی میں وہی چاک کا ٹکڑا تھا جسے اس نے سیاہ تختے پر لکھ لکھ کر اپنی جان گنوائی تھی۔

ماں باپ نے ایک ایک لمحہ، ایک ایک گھڑی اور ایک ایک دن کیسے گزارے اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ انھیں موہوم سی امید تھی کہ کوئی نہ کوئی نیہا کی خبر ضرور لے کر آئے گا۔ وہ اپنی ساری جائیداد اغوا کرنے والے کو سونپنے کے لیے تیار تھے اگر وہ ان کی نیہا لوٹا دیتا۔ مگر کہیں سے کوئی فون نہیں آیا۔ نیہا کے پتا جی ہر گھنٹے پولیس سٹیشن فون کر کے پوچھ لیتے اور دن میں ایک دو بار خود بھی پولیس سٹیشن چلے جاتے۔ وہ پولیس کے اعلیٰ افسروں سے بھی ملے لیکن ناکام رہے۔

بدھوار کی صبح حسب معمول سکول کھولا گیا اور صفائی کرمچاری کمروں کی صفائی میں جٹ گئے۔ ہاتھ میں جھاڑو لیے جونہی ایک صفائی کرمچاری نے چوتھی جماعت کے کمرے میں قدم رکھا، اندر سے سڑاند کے بھبھکے نے اس کا استقبال کیا۔ دفعتاً اس کی نظریں سامنے بلیک بورڈ کے پاس فرش پر پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی لڑکی کی لاش پر پڑی۔ وہ گھبرا گیا اور دوڑتا بھاگتا چوکیدار اور دوسرے صفائی کرمچاریوں کو بلا کر لے آیا۔ پھر پرنسپل، پولیس اور نیہا کے والدین کو خبر کر دی گئی۔ کمرے کے اندر جاتے ہی سب کی نظریں فرش پر پڑی ہوئی معصوم نیہا پر پڑیں جو ابدی نیند سو رہی تھی۔ پھر ان کی نظریں بلیک بورڈ پر پڑیں جس پر اس معصومہ نے بار بار ایک ہی بات دہرائی تھی۔

"ممی ...ممی ... مجھے ڈر لگ رہا ہے!... پاپا... پاپا... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے!....سوری میڈم...سوری میڈم...اب میں پاٹھ یاد کر کے آیا کروں گی...میڈم مجھے معاف کر دو...سوری میڈم ...سوری میڈم...میں کل سے کبھی بنا پاٹھ یاد کیے نہیں آؤں گی...سوری میڈم...سوری میڈم...سوری میڈم.... مجھے گھر جانے دو... میڈم مجھے گھر جانا ہے...میڈم مجھے ڈر لگ رہا ہے....سوری میڈم ...سوری میڈم.....!...ممی مجھے بچاؤ.... پاپا مجھے یہاں سے لے جاؤ...مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پاپا... آپ کہاں ہو؟... پاپا، جلدی آ جاؤ....!"

☆☆☆☆☆

آگ کا دریا

میری پہلی پوسٹنگ تھی۔ تجربے کی کمی ہونے کے سبب فائیلوں پر فیصلے دینے میں ہچکچاہٹ محسوس ہورہی تھی۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ فائلیں تو نپٹانی تھیں۔ آخر تنخواہ کس بات کی لے رہا تھا۔ ماتحتوں پر بھروسہ کر کے کام چلانا پڑتا تھا۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں دیانت داری کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور میری یہ نیک نامی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

دفتر میں میرے تحت ایک ایماندار ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ، ڈاک خانہ جات کام کرتا تھا۔ نام تھا اومکار ناتھ۔ میں من ہی من میں خوش تھا کہ چلو ماتحت کا اخلاق اور کردار بے داغ ہے اس لیے اس سے صلاح مشورہ لیا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں دفتر کے کمپلینٹ انسپکٹر، جس کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا، سے پوچھ لیا۔" میں نے سنا ہے کہ آفس کا ڈی ایس پی جب بھی کہیں گاؤں کے ڈاکخانوں کا معائنہ کرنے جاتا ہے، اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لے کر جاتا ہے۔ کسی برانچ پوسٹ ماسٹر کے گھر میں چائے تک نہیں پیتا، سگریٹ، پان بیڑی کا تو سوال ہی نہیں۔ اتنا ایمان دار ہے تو کسی ہوٹل میں کیوں نہیں ٹھہرتا اور وہاں پر کھانا کیوں نہیں کھاتا؟ حکومت تو ہمیں باضابطہ سفری بھتّہ دیتی ہے۔"

جواب ملا۔" سر آپ کو ابھی اندازہ نہیں ہے کہ انسپکٹر طبقے کو دور دراز علاقوں میں کن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کچھ گاؤں میں دن میں ایک ہی بار بس چلتی ہے جب کہ کئی دوسرے گاؤں میں دو تین روز میں ایک بار بس چلتی ہے۔ کبھی کبھار تو میلوں پیدل چلنا پڑتا ہے۔ پہاڑوں کو عبور کر کے، جنگلوں سے گزر کر یا پھر گھٹنے تک برف میں خود کو گھسیٹ کر۔ گاؤں میں ہوٹل

کہاں ہوتے ہیں سر۔ برانچ پوسٹ ماسٹر کے گھر میں ٹھہرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں اس کی میزبانی قبول نہ کریں تو پھر کہاں جائیں؟''

''ہاں یہ بات تو ہے مگر آپ قاعدے قانون بالائے طاق نہیں رکھ سکتے ہیں۔ محکمے کے ہدایت ناموں میں صاف طور پر درج ہے کہ معائنے کے دوران ہمیں اپنے ماتحتوں کی خاطر تواضع منظور نہیں کرنی چاہیے۔''

''سر یہ تو ناممکن ہے۔ ڈی ایس پی صاحب کو ہی لیجیے، انھیں کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے.... یا تو کھانا اپنے ساتھ لینا پڑتا ہے یا پھر بھنے ہوئے چنے پوٹلی میں بھر کر ساتھ رکھتے ہیں۔ بی پی ایم کے گھر میں رہتے تو ہیں مگر ان سے پانی کے علاوہ کچھ بھی نہیں لیتے۔ ان کا بس چلتا تو وہ پانی بھی نہ مانگتے۔''

''پھر گورنمنٹ ایسے قانون بناتی ہی کیوں ہیں جن پر عمل کرنا ممکن نہ ہو؟''

''سر، انگریزی کا ایک مقولہ ہے، قانون بنتے ہی ہیں توڑنے کے لیے۔ (Rules are made but to be broken)۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ قانون وہ لوگ بناتے ہیں جن کو فیلڈ کا تجربہ نہیں ہوتا۔ انھیں کیا معلوم کہ فیلڈ سٹاف کو کہاں کس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

یونینیں اس ایماندار افسر کے خلاف آئے دن شکایتیں کرتی تھیں۔ کسی کا میڈیکل بل منظور نہیں ہوتا تھا، کسی کا ٹی اے بل پاس نہیں ہوتا تھا، کسی کے اوور ٹائم الاونس بل میں مین میکھ نکالی جاتی تھی اور کوئی جعلی ایل ٹی سی بل بھرنے کی پاداش میں پکڑا جاتا تھا۔ یہ سارے بل ڈی ایس پی صاحب کی میز پر آکر رک جاتے تھے کیونکہ ان کی پارکھی نظر جعلی بلوں کو ایک دم تاڑ جاتی تھی۔ ویسے بھی ہمارے ملک میں جعلی بل بنانے کی باضابطہ دکانیں کھل چکی ہیں اور افسر شاہی کی ذہنیت ایسی ہے کہ فرسودہ قانون بنا کر غریب ملازموں کو مکر وفریب کا سہارا لینے پر مجبور کرتی ہے۔ غریب جنتا کو چھوڑیے یہاں تو ایوانوں میں بیٹھے ہمارے معزز نمائندے بھی اکثر ایسی گھنونی حرکتیں کرتے

رہتے ہیں۔

اومکار ناتھ کو ان باتوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ میرے کندھے پر بندوق رکھ کر گولی چلاتا تھا مگر یہ سچ ہے کہ اپنے افسروں اور یونینوں کے سامنے مجھے جواب دہ ہونا پڑتا تھا۔ اومکار ناتھ کی فطرت ایسی تھی کہ وہ اگر میری جگہ ہوتا تب بھی وہی کرتا جواب کرر ہا تھا۔ اس کے بارے میں سنا ہے کہ جب وہ اننت ناگ ہیڈ پوسٹ آفس میں بحیثیت پوسٹ ماسٹر تعینات تھا ہر کوئی اس کی ایمانداری سے تنگ آچکا تھا۔ نہ خود کھاتا تھا اور نہ دوسروں کو کھانے دیتا تھا۔ نہ جھوٹے اوورٹائم بل بنانے کی اجازت تھی اور نہ ہی پوسٹ مین پارسل اٹھانے کے جھوٹے بل بنا سکتے تھے، نہ جھوٹے میڈیکل بلوں پر کاونٹر سائن ہوتے تھے اور نہ ہی جھوٹے ایل ٹی سی بل پاس ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ نیشنل سیونگس ایجنٹوں پر بھی، جنھوں نے ڈاک خانے کے ماحول کو کثیف بنا دیا ہے، لگام لگا دی گئی تھی۔ اِدھر ملازم بے چین تھے، اُدھر سیونگ ایجنٹ پریشاں تھے۔ انگریزی کا مقولہ ہے کہ گلشن میں ایک ابابیل آنے سے بہار نہیں آتی (One swallow doesn't make a summer)۔ سارا ماحول اومکار ناتھ کے خلاف تھا اور وہ اکیلا ان سازشوں سے جوجھ رہا تھا۔ پبلک کی جانب سے دھڑا دھڑ شکایتیں بھیجی جارہی تھیں۔ یونینیں روزانہ مظاہرے کرر ہے تھے، پہلے ہیڈ آفس میں، پھر ڈویژنل آفس میں اور آخر کار سرکل آفس میں۔ جو افسران شکایتوں کی تفتیش کے لیے بھیجے جاتے وہ خود اومکار ناتھ سے خار کھائے بیٹھے تھے کیونکہ ان کی سفارشیں کام نہیں کرتی تھیں اور ان کی بالائی یافت بند ہو چکی تھی۔ انھوں نے شکایتوں کی تائید کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین ہی مہینوں میں اومکار ناتھ کو واپس سرکل آفس ٹرانسفر کیا گیا جہاں وہ صبح و شام فائیلوں میں کیڑے نکالتا رہا۔

سرکل آفس میں اس نے تین سال بڑے آرام سے نکالے۔ نہ کسی سے دوستی اور نہ کسی سے بیر، صرف اپنے کام سے مطلب۔ یہیں پر اس کی پرموشن ہوئی اور اس کو میرے آفس میں بطور

ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ تعینات کیا گیا۔ بڑا خوش تھا کہ چلو افسر بھی اپنے ہی مزاج کا ملا، کچھ دن مزے سے گزر جائیں گے۔ اِدھر میں بھی خوش ہوا کہ میرا ماتحت دیانت دار ہے اور چنانچہ میری پہلی پوسٹنگ ہے، اس لیے ایسا ڈپٹی ملنا خوش نصیبی ہے۔ میں من ہی من میں اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ جو فائیل سامنے آتی تھی اس پر کچھ نہ کچھ منفی نوٹ لکھ دیتا تھا۔ کام بہت رکا پڑا تھا۔ کوئی بل پاس نہیں ہو رہا تھا۔ اکثر میڈیکل یا ایل ٹی سی بل جانچ کے لیے بھیج دیتا تھا جس کے سبب دو تین مہینے کی دیر ہو جاتی تھی۔ اُدھر مالی سال ختم ہو جاتا، اِدھر فنڈس بنا خرچ واپس چلے جاتے اور ہمیں دوسرے مالی سال کا انتظار کرنا پڑتا۔ مجھے ہر ماہ یونین میٹنگوں میں یہی سننا پڑتا تھا کہ بل پاس نہیں ہو رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کام نہیں کرتے ہیں۔ صرف مین میکھ نکالتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود میں اسے برداشت کر لیتا تھا۔ کئی بار اس کو سمجھایا کہ سبھی بل جانچ کے لیے مت بھیجا کرو، ہاں جو ملازم جھوٹے بل پیش کرنے کے عادی ہوں، ان کے بل جانچ کے لیے بھیجا کرو۔ لیکن وہ مائی کا لال کہاں سننے والا تھا، بل میں کوئی نقص دیکھا نہیں کہ بل چلا جانچ کی خاطر۔

فروری کا مہینہ تھا۔ سوپور سے ایک انسپکٹر میرے آفس آیا اور نو ہزار آٹھ سو کے بل سامنے رکھ کر کہنے لگا۔ "صاحب جی، حال ہی میں پی ایم جی صاحبہ نے بانڈی پور گریز لائن کا معائنہ کیا اور وہاں کی ڈاک سرائے (رَنر ہٹس) کی خستہ حالت دیکھ کر بہت ناراض ہو گئیں۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ تین میں سے ایک بیچ والی سرائے کی مرمت مقامی ذرائع سے فوراً کروالوں کیونکہ سِوِل وِنگ نے سبھی سرائیوں کو مرمت کرنے کے لیے بیس لاکھ کا تخمینہ بھیجا ہے جو بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے مجھ سے مرمت کا تخمینہ پوچھا۔ میں نے ایک سرائے کے لیے نو ہزار نو سو کا حساب بنا کر دے دیا۔ اس پر میڈم نے فی الحال ایک سرائے کی مرمت کروانے کا حکم دیا۔ اس لیے میں نے اس کی مرمت کروادی اور یہ بل لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ سات ہزار کی لکڑی آئی، ایک ہزار پانچ

سو بطور اجرت کے دینا پڑے اور ایک ہزار تین سو بطور دیگر اخراجات خرچ ہوئے۔''

میں نے بل دیکھ لیے، پھر ڈپٹی کو بلایا اور اسے کہا۔ ''ڈپٹی صاحب، کستوری لال کچھ بل لے کر آیا ہے۔ انھیں فائیل میں ایک نوٹ چڑھا کر منظوری کے لیے پیش کر لیں۔''

ڈپٹی خشمگیں نظروں سے انسپکٹر کو دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو ''بھئی آج کون سا نیا گُل کھلانے آئے ہو۔'' کستوری لال بد دیانتی کے لیے خاصا بدنام تھا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ بد اچھا بدنام بُرا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ کچھ نہ کچھ مصیبت لے کر ضرور آیا ہوگا۔ ڈپٹی اونچے سروں میں پوچھنے لگا۔ ''ہاں بھئی، کیا ہے یہ۔ اس بارے میں پی ایم جی کا کوئی تحریری آرڈر ہے تمھارے پاس؟ اور پھر کچھ ٹینڈر وغیرہ تو کیے ہوں گے؟'' ان دنوں پانچ ہزار کے اوپر ٹینڈر کرنا ضروری تھا۔

''جناب، پی ایم جی صاحبہ وہاں آئی تھیں اور ان کا حکم تھا کہ ایک ہفتے میں اس ہٹ کی مرمت ہونی چاہیے اور جتنا سامان ضرورت ہو وہ مقامی بازار سے خرید لو۔ انھوں نے خود زبانی آرڈر دیا تھا اور پھر اتنے قلیل وقت میں ٹینڈر کہاں سے نکل سکتا تھا۔''

''تمھیں ڈویژنل آفس سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔ ہم ان سے تصدیق کروا لیتے اور پھر یہیں سے قلیل مدتی ٹینڈر رایشوع کر لیتے؟''

''سر، پی ایم جی صاحبہ کا حکم تھا، میں کیسے ٹال سکتا تھا۔ ہفتے بھر میں سب کام مکمل کرنا تھا۔ وہ تو انتباہ کر کے چلی گئی تھیں۔''

''تو پھر جا کر انھی سے پاس کراؤ، یہاں کیوں آ گئے۔'' ڈپٹی نے کرخت لہجے میں جواب دیا۔

''سر، وہاں کیسے جاؤں۔ بل تو ڈویژنل آفس ہی پاس کرے گا۔''

''پہلے سرکل آفس سے تحریری آرڈر لے کر آ جاؤ۔ بل ایسے پاس نہیں ہوتے۔''

میں نے مصلحتاً کستوری لال کو کچھ دیر کے لیے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہہ دیا۔

اس کے بعد ڈپٹی صاحب پر اعتماد جتاتے ہوئے رازداری کے ساتھ اس سے ہمکلام ہوا۔ ''ڈپٹی صاحب، آپ کو معلوم ہوگا کہ میری اور پی ایم جی صاحبہ کی نہیں بنتی ہے۔ کئی باتوں پر ہمارا مت بھید رہا ہے۔ اگلے مہینے وہ میرا سالانہ خفیہ رپورٹ لکھیں گی۔ اس لیے اس وقت مزید جھگڑا مول لینا اچھا نہیں ہوگا۔ بات کاٹ لو اور جیسے تیسے بلیں پاس کرلو۔'' بات دراصل یوں تھی کہ کئی مہینوں سے ہمارے درمیان رسہ کشی چل رہی تھی۔ میں اب یہ کوشش کررہا تھا کہ کم سے کم سال کے آخری مہینے میں باس کا غصہ ٹھنڈا کرلوں اور ناراض ہونے کا پھر کوئی موقع نہ دوں۔

''نو سر، ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اس کی آواز قدرے بلند ہوگئی۔ ''میں ان بلوں پر کارروائی نہیں کرسکتا۔ آرڈر نہ تصدیق اور نہ یہ معلوم کہ زمینی حقیقت کیا ہے۔ یہ کام ہوا بھی یا نہیں، کسے معلوم؟ ہوسکتا ہے ہوا ہی نہ ہو یا پھر غیر معیاری ہوا ہو۔ دراصل ہمارے محکمے کے ساتھ فراڈ کھیلا جارہا ہے اور سارا روپیہ لوٹا جارہا ہے۔''

میں نے پھر نرم لہجے میں کہا۔ ''اچھا ایسا کرلو، آپ فائیل میں ایک نوٹ ٹائپ کروا کے چڑھاؤ اور دستخط کرنے کے بغیر ہی مجھے بھیج دو۔ میں خود ہی اس پر دستخط کرلوں گا۔''

''سر، ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں اس لوٹ میں شریک نہیں ہوسکتا۔ میں نہ تو فائیل بناؤں گا اور نہ ہی اس پر نوٹ لکھواؤں گا۔ یہ کام سراسر غلط ہورہا ہے۔'' وہ اونچی آواز میں بدستور بول رہا تھا ۔''چاہے آپ ناراض ہوں یا خفا ہوں، چاہے مجھے معطل کرلیں یا پھر فرد جرم ایشوع کرلیں، میں یہ کام کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں اور نہ ہی اس کام کے ساتھ کسی بھی طرح وابستہ ہونا چاہتا ہوں۔''

میرے سامنے میرا ماتحت کھلم کھلا عدول حکمی کررہا تھا۔ جی میں آئی کہ اسی وقت اس پر تادیبی کارروائی کرلوں اور اس کا تبادلہ کروالوں۔ لیکن میں نے اپنا آپا نہیں کھویا۔ صرف اس کو کمرے سے باہر جانے کے لیے کہہ دیا۔ پھر کستوری لال کو واپس بلا کر اسے دوسرے دن آنے کا

حکم دیا۔

رات بھر میں فکر و تردّد میں ڈوبا رہا۔ ''کیا میرا ڈپٹی بغاوت کر رہا ہے یا پھر اپنے اصولوں سے ہٹنے کو تیار نہیں ہے؟ اس میں اتنی سخت مزاجی کیوں ہے؟ نوکری میں تھوڑا بہت ایڈجسٹ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان بلوں پر کارروائی کرنے میں اس کا کیا جاتا، ہم تو صرف اوپر والے افسر کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔''

پھر کہیں اندر.... بہت اندر سے آواز آئی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی۔ ''یہ وہ بندہ ہے جس نے آج تک کسی بی پی ایم کے گھر میں چائے کا قطرہ بھی نہیں پیا ہے۔ جو گھر سے دفتر سائیکل پر آتا ہے۔ جس نے کبھی کسی سے دس روپے کی رشوت نہیں مانگی ہے۔ پھر وہ ان بلوں کو پاس کرنے کی سفارش کیسے کر سکتا ہے۔ وہ ایسے افعال پر ہمیشہ لعنت بھیجتا رہا ہے۔ میری سنو، تمھیں بھی اس سے کچھ سیکھ لینا چاہیے۔ ایمانداری صرف نمائشی نہیں ہوتی بلکہ فکر و عمل سے جھلکنی چاہیے۔''

صبح سویرے میں دفتر پہنچ گیا۔ کستوری لال میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کو کمرے میں بلایا اور کہا۔ ''دیکھو، پی ایم جی صاحبہ نے یہ زبانی آرڈر تم کو دیا تھا اس لیے تم یہ کیس اپنے آفس میں بنا کر میرے پاس پوری تفصیل کے ساتھ بھیج دو۔ اس نے ویسا ہی کر لیا اور ہمارے آفس نے منظوری دینے کی سفارش کی۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ اس روز ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ غیر حاضر تھے۔ میں نے فائیل پر اپنے دستخط ثبت کر لیے اور احتیاط کے طور پر آرڈر کی کاپی مع تفصیل کے پی ایم جی آفس برائے تصدیق بھیج دی۔ وہاں سے نہ کوئی جواب ملا اور نہ کوئی تفتیش ہوئی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

بہت عرصہ بعد میں پوسٹل سٹاف کالج میں نئے بھرتی ہوئے افسروں کو سی ایس کنڈکٹ رولز یعنی افسروں کے چال چلن کے قوائد پڑھا رہا تھا۔ اعلیٰ افسروں کے حکم سے متعلق میری نظر ایک وضاحتی نوٹ پر پڑی۔ لکھا تھا کہ جب کوئی اعلیٰ افسر زبانی حکم صادر کرے تو اس

صورت میں اس حکم پر عمل آوری کر کے فوراً اس کی کاپی اعلیٰ افسر کو تصدیق کے لیے بھیج دینی چاہیے۔ یا تو وہ اس کی تصدیق کرے گا یا پھر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرے گا۔ دونوں صورتوں میں آرڈر ایشوع کرنے کی بات قبول مانی جائے گی۔ مجھے سولہ سال پرانا وہ واقعہ یاد آرہا تھا اور دل میں خوشی ہو رہی تھی کہ ایک دیانت دار ماتحت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مجھے ایمان داری پر کاربند رہنے کا پہلا اور سب سے بڑا اسبق ملا تھا۔

اپنے اپنے زاویے

دیکھتے ہی دیکھتے دو فرقوں کے درمیان ایسا گھمسان کا رَن چھڑ گیا کہ کشتوں کے پُشتے لگ گئے۔

بستیاں سڑک کے دو کناروں پر آباد تھیں۔ دائیں کنارے پر ہندو رہتے تھے اور بائیں کنارے پر مسلمان۔ درمیان میں سڑک شاہ رگ کا کام کرتی تھی۔ صدیوں سے ان بستیوں کے آپسی بھائی چارے کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ مسلمان سبزی فروش روز صبح سویرے اپنی ریڑھیاں کھینچتے ہوئے ہندو بستی میں ہانک مارتے اور سبزیاں فروخت کر کے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ گوالے سائیکلوں پر بڑے بڑے ڈول لٹکا کر دودھ تقسیم کر لیتے۔ کئی کاریگروں جیسے درزی، موچی، سائیکل اور سکوٹر مرمت کرنے والوں نے ہندو بستی میں مستقل طور پر دکانیں کھول رکھی تھیں۔ دو ایک قصائیوں نے بھی کرائے پر کھوکھے لیے تھے جن میں حلال بکرے و مرغے کا گوشت اور انڈے فروخت ہوتے تھے۔

اُدھر دوسری بستی میں زیادہ تر کاروباری اور ملازم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ ملازم پیشہ لوگ سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں چھوٹی بڑی نوکریاں کرتے تھے اور زندگی بڑی ٹھاٹ سے گزارتے تھے۔ جو لوگ تاجر پیشہ تھے انھوں نے اپنی بستی کے علاوہ سڑک کے اس پار کپڑے، ہوزری، منیاری اور ادویات کی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ صبح سویرے دکان پر پہنچ کر لکشمی کی آرتی اتارتے، لوبان جلا کر ساری دکان کو سوگندھت کرتے اور تب جا کر کاروبار کا شری گنیش ہوتا۔ البتہ

کچھ ایک کا پشتینی پیشہ ساہوکاری تھا۔ چنانچہ بنکوں کا جال بچھ جانے کے باوجود غریبوں کو وقتِ ضرورت آسانی سے قرضہ نہیں ملتا تھا اس لیے موقعے کا فائدہ اٹھا کر یہ ساہوکار حاجت مندوں کو بھاری شرح سود پر سرمایہ مہیا کرنے کا دھندا کرتے۔ ان ساہوکاروں نے کئی گرگے پال رکھے تھے جو ڈرا دھمکا کر مقروضوں سے بقایا رقمیں وصول کرتے اور اگر سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا تو قانونی چارہ جوئی کا سہارا لیتے۔ یا تو کھڑی فصلوں پر حق جتاتے یا پھر جائیداد ہڑپ لیتے۔ خیر اس پیشے کا تقاضہ ہی کچھ ایسا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کا پانی ڈھل جاتا۔

کچھ روز پہلے نہ جانے کیا ہوا۔ اچانک دونوں بستیوں سے ایک ہی وقت پر آگ کی لپٹیں نمودار ہوگئیں۔ لوگ گھروں سے باہر نکل کر غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ ایک طرف ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں اور فلک شگاف تکبیر کے نعرے لگ رہے تھے اور دوسری طرف ترشول اور خنجر تھے اور جے شری رام کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ آخر یہ آگ کیسے لگی، کس نے لگائی اور کیوں لگائی؟ تعجب کی بات یہ تھی کہ دونوں بستیوں میں ایک ہی وقت پر آگ نمودار ہوئی۔ فریقین ایک دوسرے کو دوش دے رہے تھے۔ افواہوں کا بازار لحہ بہ لحہ گرم ہو رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ رات کو مندر کے احاطے میں گائے کا سر کاٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ مسجد کے احاطے میں کسی نے سُوَر کا گوشت پھینکا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ کسی مسلم نوجوان نے لَو جہاد کے لیے غریب معصوم ہندو لڑکی کو زبردستی اٹھا لیا تھا جبکہ کوئی اور کہہ رہا تھا کہ کسی ہندو نوجوان نے مسلم لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی چشم دید نہ تھا۔ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ آگ کس نے لگائی کوئی بتا نہیں پا رہا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ آج کل ایسی افواہیں سوشل میڈیا اور ایس ایم ایس کے ذریعے پلیگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ سائنس کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی سوجھ بوجھ، معقولیت اور تحلیلی صلاحیت نشو و نما پائے گی مگر یہاں تو الٹا ہی معاملہ ہو رہا ہے۔ بے لگام ذرائع ابلاغ خاص کر ٹیلی ویژن چینلیں اور سوشل میڈیا آئے دن

آگ پر تیل ڈالتے ہیں اور انسان کی بہیمی جبلت کو مشتعل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں مکانات خاکستر ہو گئے۔ فسادات کے سبب جو لوگ سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ تھے کسان، مزدور، کاریگر اور طلبہ۔ گھر جلے، گھروں کا سامان خاک ہو گیا، کپڑے لتے اور کتابیں راکھ ہو گئیں۔ سیکڑوں لوگ بے گھر ہو کر کھلے میدانوں میں کینواس، پولی تھین اور ٹاٹ کے عارضی خیموں تلے زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ نہ پینے کا پانی، نہ بجلی، نہ رہنے کی جگہ، نہ حشرات الارض سے بچنے کی کوئی سبیل۔

دوسرے روز سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی مختلف فرقوں کے مذہبی رہنما وارد ہوئے۔ زرق برق شیروانی پہن کر، سر پر بیش قیمتی قراقل سجا کر، ڈاڑھی میں خضاب لگا کر، آنکھوں میں سرمہ لگا کر اور بدن پر عطر مل کر یا پھر گیروے لباس پہن کر، ماتھے پر لمبا سا کیسری تلک لگا کر، انگلیوں میں قیمتی جواہرات کی انگوٹھیاں لگا کر اور گلے میں رودراکش کی مالا ڈال کر۔ ان کے تعاقب میں سیاست دان بھی آ پہنچے جو اپنی سیاسی پارٹیوں کے لباس اور ٹوپیوں میں ملبوس تھے۔ ان رہنماؤں نے غریب لوگوں کے جذبات بھڑکانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور لاچار غریب لوگ چپ چاپ سنتے رہے۔ عورتیں اپنے بھوکے بلکتے بچوں کی خاطر صرف اس تلاش میں نکل آتی تھیں کہ کہیں کوئی ترس کھا کر آٹا چاول بطور ریلیف دے دے تو وہ آنچل میں سمیٹ کر گھر لے جاتیں مگر راشن کہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا، وہاں تو صرف بھاشن ہی بھاشن برس رہے تھے۔ بستیوں میں جتنے بھی خوش حال لوگ تھے انھوں نے اپنے گھروں میں تالے لگا کر دور اپنے رشتے داروں یا دوستوں کے ہاں پناہ لی۔ ان میں سے یہاں کوئی نظر ہی نہ آ رہا تھا۔

حکومت کو جاگنے میں دو تین روز لگ گئے۔ فوڈ کارپوریشن کے بوسیدہ گوداموں میں سڑ رہا راشن لے کر ریلیف گاڑیاں دونوں کیمپوں میں نظر آنے لگیں جنھیں دیکھتے ہی لوگ چھینا جھپٹی پر اتر آتے۔ پانی کے ٹینکر جہاں کھڑے ہو جاتے وہاں تشنگی کم ہونے کے بجائے کیچڑ زیادہ ہو

جاتی۔افسر شاہی کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔وہ ہمیشہ ایسی عرشی و فرشی آفتوں کے انتظار میں رہتے ہیں۔ بڑی لوٹ کے یہی موقعے ہوتے ہیں اور ایسے موقعے وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔دوسری جانب سیاسی لیڈر اس کوشش میں تھے کہ ریلیف کی نیک نامی اور شہرت انھیں مل جائے، اس لیے وہ بار بار یہ کہنے سے نہیں چوکتے تھے کہ یہ ریلیف صرف ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔غنڈے، بدمعاش اور دلال سب شکار کی ٹوہ میں گھات لگائے بیٹھے تھے جیسے اوپر والے نے ان کی دعائیں قبول کر لی ہوں۔ پولیس یوں ظاہر کر رہی تھی کہ بندوبست کرنے میں وہ اتنے مصروف ہیں کہ ان لوگوں پر قابو نہیں پا سکتی۔

چہار سو خون میں ابال پیدا کرنے والے نعرے لگ رہے تھے۔ نہتے لوگ تہ تیغ ہو رہے تھے اور معصوم کمسن دوشیزائیں انسانی ہوس کا شکار ہو رہی تھیں۔اشرف المخلوقات پھر ایک بار بہیمیت کا پیکر بن چکا تھا۔ذرائع ابلاغ کے نمائندے وارداتوں کی خبریں لانے میں چاروں اور پھیلتے چلے گئے-اخباروں کے نمائندے، میگزینوں کے نمائندے، ٹیلی ویژن چینلوں کے رپورٹر اور کیمرہ مین ۔ٹی وی چینلوں پر یہ خبریں چوبیس گھنٹے نشر ہو رہی تھیں۔

اس فرقہ وارانہ فساد کو بے نقاب کرنے کے لیے دہلی کے دو قومی اخباروں نے اپنے دو نمائندے بھیج دیے۔ دونوں نے جرنلزم کا کورس ایک ساتھ ایک ہی کالج سے کیا تھا اور تب سے دوستی نباہ رہے تھے۔نام تھے- جہانگیر خان اور جسونت سنگھ۔دونوں ساتھ ساتھ جائے واردات پر پہنچ گئے مگر گاڑی میں سے اترنے سے پہلے ان کے سامنے بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہوا۔دونوں رہیں گے کہاں؟ نہ ہوٹل اور نہ گیسٹ ہاؤس۔پھر ایک ساتھ رہنا بھی تو مشکل تھا۔سڑک کے ایک کنارے ہندو تھے اور دوسرے کنارے مسلمان۔ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان۔

کل تک جو سڑک شاہ رگ کا کام کرتی تھی اب وہ سرحد بن چکی تھی۔دونوں طرف چوکسی بڑھ چکی تھی۔لوگ ہر متحرک پرچھائیں کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔دونوں دوستوں نے

فیصلہ کیا کہ وہ الگ الگ اپنے فرقے کے لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔ یہ ان کی مجبوری تھی حالانکہ انھوں نے پہلے کبھی اس ڈھنگ سے سوچا نہ تھا۔ جب انسان کو جینے کے لالے پڑ جاتے ہیں اسے انسانیت مخالف قوتوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوکر الگ الگ بستیوں میں چلے گئے۔

جسونت سنگھ نے ایک چائے کی دکان میں ڈیرا ڈال دیا اور پھر اپنے کام میں جُٹ گیا۔ سب سے پہلے اسے ایک سرغنہ کا سامنا ہوا جس کو نہ جانے کہاں سے یہ بھنک پڑی کہ چائے کی دُکان پر ایک جرنلسٹ نے پناہ لی ہے۔ اس نے آنکھ جھپکتے ہی بہت سارے لوگ جمع کر لیے جو ہاتھوں میں ترشول اٹھائے ہوئے تھے اور 'جے شری رام'، 'رام جنم بھومی ہماری ہے' اور 'رام مندر بن کے رہے گا' کے نعرے بلند کر رہے تھے۔

جسونت سنگھ نے ایک نوجوان سے پوچھا۔ ''بھائی کیا بات ہے؟ یہاں دنگا کس بات پر ہوا؟''

''ارے کیا بتائیں صاحب۔ اس پار والوں نے گئو ماتا کی ہتھیا کر کے مندر کے پھاٹک کے سامنے مانس ڈال دیا۔ یہ بابر کی سنتانیں ہیں۔ ہمارے ملک پر پھر سے قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔''

''آپ کو پتا چلا کہ یہ کام کس نے کیا ہے؟''

''ارے صاحب معلوم ہوتا تو کیا ہم اس کو زندہ چھوڑ دیتے۔ مگر اتنا تو طے ہے کہ یہ کام ان کے بغیر کوئی کر ہی نہیں سکتا ہے۔'' بھیڑ میں سے کوئی اور آدمی بول پڑا۔

''میں نے سنا ہے کہ دونوں بستیوں میں بہت دنوں سے تناؤ چل رہا تھا۔ نہ اِس طرف مسلمان آتے تھے اور نہ اس طرف ہندو جاتے تھے۔ ہر طرف چوکسی بڑھ چکی تھی۔ پھر اُس بستی کا آدمی یہاں کیسے آسکتا ہے؟ کوئی اپنی جان پر کیوں کھیلے گا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو صاحب۔ رات کے اندھیرے میں کوئی آیا ہوگا۔ ان کے مذہب

میں تو یہی کچھ سکھایا جاتا ہے۔ جہاد! جنت اور حوریں! یہ لوگ آرام سے بیٹھ ہی نہیں سکتے ہیں۔"

"چلو آپ کی ہی بات مان لیں۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب اس مار دھاڑ سے کیا فائدہ ملے گا؟"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے! ان کو سبق تو سکھانا ہی پڑے گا۔ پچھلے کئی دنوں سے انھوں نے ہمارے تین آدمیوں کو مار دیا ہے۔ اس کا بدلہ تو لینا ہی پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہم چاہتے ہیں کہ بھارت کی نکمی سرکار اکثریت کی طاقت سمجھ لے۔ وہ اقلیتوں کو سر چڑھا رہی ہے۔ سرکار کو رام جنم بھومی پر رام مندر بنانے کی اجازت جلد از جلد دینی چاہیے۔"

"یہ رام جنم بھومی کہاں ہے، آپ کو معلوم ہے؟"

بھیڑ میں کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ رام جنم بھومی کہاں ہے، تمھیں تو معلوم ہوگا؟

پھر ایک آدمی جس نے ٹیلی ویژن پر اس بارے میں سنا تھا، کہنے لگا۔ "ارے صاحب آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم۔ اتر پردیش میں ہے۔ ہم نے دیکھی تو نہیں ہے مگر اتنا معلوم ہے کہ رام جی کا جنم ایودھیا میں ہوا تھا اور مندر کو گرا کر بابر نے مسجد بنوائی تھی۔"

اس گفتگو کے بعد بھی جسونت سنگھ کئی لوگوں سے ملتا رہا۔ سبھی نے اس واردات کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ سب ایک سُر میں بولتے رہے کہ صدیوں سے دونوں بستیوں میں امن و چین تھا مگر حال ہی میں نہ جانے کن شر پسندوں نے آگ لگائی۔ یہ پوچھنے پر کہ اس شرارت میں پہل کس نے کی تو ہر کوئی دوسری بستی والوں کو دوشی قرار دے رہا تھا۔

اُدھر سڑک کے اُس پار جہانگیر خان نے بھی ایک چھوٹے موٹے چائے خانے میں پناہ لی جو بعضے مسافر خانہ کا کام بھی دیتا تھا۔ چائے خانہ کے مالک کو جب اس کی اصلیت معلوم ہوئی تو اس نے پرتپاک انداز میں کہا۔ "جناب، آپ تو مسلمان ہیں۔ معلوم ہی ہے کہ ہم پر کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ ہماری تو کوئی بات ہی نہیں سنتا۔ آئے دن پولیس تنگ کرتی رہتی ہے۔ یہ میرا چھوٹا موٹا چائے

خانہ ہے۔ کوئی آ کر رات بھر رہ جاتا ہے مگر دوسرے ہی دن پولیس آ کر چھاپہ مارتی ہے اور پوچھتی ہے کہ وہ کون تھا... کہاں سے آیا تھا... کس لیے آیا تھا... اکیلا تھا یا اس کے ساتھ اور بھی کوئی تھا؟ جناب، یہ دھندہ بھی سر درد بن چکا ہے۔ بھلا آپ ہی بتائیے کہ اگر میں گاہک سے اس کی پہچان اور اس کے مدعا کے بارے میں پوچھتا پھروں تو کیا کوئی یہاں قیام کرنے کے لیے رُکے گا؟ پولیس کو ہر وہ شخص جو یہاں آتا ہے دہشت گرد نظر آتا ہے۔ اس سے بہتر تو انگریزوں کا زمانہ تھا۔''

جہانگیر خان جب وہاں سے باہر نکلا تو سڑک پر بھیڑ جمع تھی۔ 'نعرۂ تکبیر، اللہ و اکبر'، 'بابری مسجد کے ملزموں کو پھانسی دو'، 'بابری مسجد ہماری ہے، وہاں پر مسجد ہی بنے گی' کے نعرے گونج رہے تھے۔ کئی لوگوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں ناچ رہی تھیں۔ جہانگیر خان نے ایک نوجوان کو الگ لے جا کر اسے پوچھا۔ ''بھئی، یہ کیا معاملہ ہے۔ کیوں اتنا سارا ہنگامہ ہو رہا ہے؟''

''ہندوؤں نے کچھ روز پہلے ہماری مسجد کے احاطے میں خنزیر ڈال کر اسے ناپاک کر دیا اور پھر رات کو بستی میں آگ لگا دی۔''

''تم لوگوں نے کسی کو ڈالتے ہوئے دیکھ لیا کیا؟''

''جناب، رات کا وقت تھا۔ ہم سب سوئے ہوئے تھے۔ کیا معلوم کون تھا۔''

''کیا ہندو اس طرف آتے ہیں؟''

''پہلے جب امن و امان تھا تو بنا جھجھک چلے آتے تھے لیکن جب سے تناؤ بڑھ گیا ہے، اب نہیں آتے۔''

''پھر تم کیسے کہتے ہو کہ یہ کام ہندو نے ہی کیا ہے؟''

''کیسی پاگلوں والی باتیں کرتے ہیں جناب۔ اور کون کرے گا؟ کیا مسلمان اپنی ہی مسجد کو ناپاک کرے گا۔''

''خیر معاملہ تو مقامی نوعیت کا ہے پھر یہ بابری مسجد کے نعرے کیوں؟''

''مسئلہ اس جگہ کا ہی نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ چاروں اور ظلم ہو رہا ہے۔ سب سے بڑا ظلم تو بابری مسجد کی شہادت کا تھا۔''

''آپ نے بابری مسجد دیکھی ہے کیا؟''

''نہیں، البتہ سنا ہے کہ بابر اللہ کا بھیجا ہوا غازی تھا۔ اس نے ہندستان میں مسلمانوں کی سلطنت قائم کرتے وقت اس مسجد کو بنایا تھا۔ یہ تو ہندوؤں کا جبر و استبداد ہے کہ ہماری مسجدوں کو مسمار کر رہے ہیں۔''

رات بھر دونوں رپورٹر مواد جمع کرتے رہے البتہ تجربات مختلف تھے۔ اسی رات سرکار نے بھی ذرائع ابلاغ کے ذریعے کچھ آنکڑے نشر کیے۔ تین تین اموات دونوں بستیوں میں، زخمی ہوئے لوگوں کی گنتی قریباً ایک جیسی تھی یعنی تیس اور بتیس، ایک طرف چالیس مکان جل چکے تھے اور دوسری طرف پینتالیس کیونکہ اُس طرف آبادی بہت گھنی تھی۔ مختصر یہ کہ دونوں فرقوں کو تقریباً ایک جیسا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

دوسرے روز جسونت اور جہانگیر دہلی پہنچے اور انھوں نے اپنی اپنی رپورٹیں داخل کر لیں۔ پھر اگلے دن دونوں رپورٹیں ان کے اخباروں کی جلی سرخیاں بن گئیں۔

جسونت کے اخبار کی چند خبریں: ''پاکستانی آئی ایس آئی نے ملک میں اپنا جال پھیلا دیا۔ ایک اور علاقہ دہشت گردی کی لپیٹ میں۔ گئو ماتا کی ہتھیا! بیس ہندو مارے گئے اور سو سے زیادہ زخمی۔ رات بھر ہندوؤں کے گھر جلتے رہے اور ان کی جان و مال کو خطرہ لاحق۔ انتظامیہ پر جوں تک نہیں رینگتی!''

جہانگیر کے اخبار کی چند خبریں: ''آر ایس ایس اور بجرنگ دل مسلمانوں کے قتل عام پر تلی ہوئی۔ رات کے وقت ترشول بانٹے گئے اور مسجد کو ناپاک کیا گیا۔ تیس مسلمان شہید اور ڈیڑھ سو سے زیادہ زخمی ہو کر ہسپتال میں۔ مسلمانوں کا اظہار تشویش۔''

دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک میں احتجاج شروع ہوا۔ ٹی وی چینلوں پر گرما گرم بحث و مباحث ہونے لگے۔ جگت استاد عالم، جن سے اگران بستیوں کی جائے وقوع پوچھی جائے تو شاید ہی بتا پائیں، مسلسل اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ کچھ ایک فرقے کی طرف داری کرنے لگے اور کچھ دوسرے فرقے کی۔ کئی روز بال کی کھال اتاری گئی اور چینلوں پر ہنگامہ ہوتا رہا۔ پھر کوئی اور ہنگامہ وجود میں آیا اور اس واردات کے بارے میں لوگ بھول گئے۔ کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ آخر کاران دو بستیوں کا کیا حشر ہوا۔

ٹی وی چینلوں کے انتظامیہ اپنے ٹی آر پی کو مسلسل ناپتے رہے...!

کچھ ویکلی اخبارات جیسے 'آوازِ ملت'، قومی آئینہ، ہندوانڈیا، کیسری درپن' کگرمتوں کی مانند پھوٹ پڑے۔

مکانوں، دکانوں اور عبادت گاہوں پر ہرے اور کیسری رنگ کے جھنڈے اب آٹھوں پہر نظر آنے لگے۔

البتہ جہانگیر اور جسونت کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ہر روز معمول کی طرح دفتر سے نکل کر کافی ہاؤس میں کافی پیتے رہے اور بار ہا پارٹیوں میں اکٹھے شراب پیتے رہے۔ لیکن دونوں نے اس بارے میں کبھی ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال نہیں کیا۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ دو بستیوں میں وہ آپسی اعتماد دوبارہ قائم نہ ہوسکا۔ ایک دوسرے پر شک وشبہ کرنا فطری بن گیا۔ مال کا تبادلہ اب سڑک پر ہوتا ہے اور دوسری بستی والے تاجر ان اشیا پر مزید نفع لاد کر اپنی بستی میں فروخت کرتے ہیں۔ قرض دینے کی روایت برقرار ہے مگر ساہوکاروں نے الگ الگ بستیوں میں اسی فرقے کے گرگے بھرتی کر لیے ہیں۔ دونوں بستیوں میں کام کاج پھر معمول کی طرح چل رہا ہے۔

کئی روز کے بعد حکومت نے واردات کی سی بی آئی جانچ کرانے کا اعلان کرلیا مگر آج

تک کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ مسجد اور مندر میں گوشت کے لتھڑے ڈالنے والا کون تھا اور بستیوں میں کس نے آگ لگائی تھی؟ ان فسادات کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں بستیوں کے ووٹ اب بستیوں کے خیر خواہوں کے لیے نہیں بلکہ جذبات کو انگیز کرنے والے طفیلی رہنماؤں کے لیے مختص ہو گئے۔
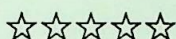
میری کہانی کا کردار

''آپ مجھے اپنی کہانی کا کردار کب بنائیں گے؟'' اس نے دوبارہ پوچھ لیا اور میں نے پھر سنی ان سنی کر دی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس کو اتنی شدت سے میری کہانی کا کردار بننے کی خواہش کیوں کر ہوئی۔ اس نے مجھ سے یہ سوال کئی بار پوچھا مگر میں ہر بار ٹالتا رہا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ ایک پڑھی لکھی نا کتخدا لڑکی ہے جس کو شادی کے نام ہی سے چڑ ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ وہ لزبین ہے اور شادی سے نفرت کرتی ہے۔ نہیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔ تیس پار کر چکی ہے مگر شباب نے ابھی تک ساتھ نہیں چھوڑا۔ گیہواں رنگ، بھرا بھرا جسم، لمبے کالے بال، شوخ دیدہ اور رسیلے ہونٹ۔ قیامت اور کیسی ہوتی ہوگی؟ اس کے بدن کا سب سے دلکش حصہ اس کی ابھری ابھری، گداز چھاتیاں ہیں جن پر ایک بار نظر پڑ جائے تو ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔

ہماری ملاقات ایک ہندی اردو کوی سمیلن میں ہوئی تھی جس میں ہم دونوں نے شرکت کی تھی۔ یہی کوئی چھ سات مہینے پہلے کی بات ہے۔ چائے کے وقفے پر ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ کومل نے ہندی میں ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے اور اردو بھی کچھ حد تک پڑھ سکتی ہے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے اس نے ہندی کے ایک مشہور افسانہ نگار پر مقالہ لکھا تھا۔ بعد میں جب ہمارے درمیان نزدیکیاں بڑھ گئیں تو پتا چلا کہ یہ مقالہ اس نے محض اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا دم چھلا جوڑنے اور اچھی سی نوکری پانے کے لیے لکھا تھا ورنہ اس کو ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ آج کل کے سند یافتہ ڈاکٹروں کی طرح انگوٹھا چھاپ

تھی بلکہ اس نے چار سال کڑی محنت کر کے ریسرچ کی ڈگری حاصل کی تھی جس کا احساس مجھے تب ہوا جب میں نے اس کا مقالہ پڑھ لیا اور کئی نکتوں پر اُسے بحث بھی کر لی۔

میری دیرینہ خواہش تھی کہ میرے افسانے ہندی میں شائع ہوں تا کہ ہندی قارئین بھی ان کو پڑھ سکیں۔ پریم چند، سدرشن یا اشک کی طرح مجھے ہندی رائٹر بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ بہت سوچ بچار کر کے میں نے کومل سے درخواست کرنے کی ٹھان لی کیونکہ وہ ہندی کے علاوہ اردو بھی پڑھ لیتی تھی۔ آخر کار میں نے ایک روز جسارت کر ہی لی۔ ''کومل جی، کیا آپ میرا ایک چھوٹا سا کام کر سکتی ہیں؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ آپ کام تو بتا دیں۔'' اس نے کام کی نوعیت جانے بنا ہی ہامی بھر لی۔

''میرے افسانوں کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ مجموعہ ہندی میں بھی دستیاب ہو۔ دراصل میری کہانیوں کے ماحول اور کرداروں کے ساتھ ہندی پاٹھک زیادہ اپنائیت محسوس کر سکتے ہیں اور وہ میری کہانیوں کی زیادہ قدر کر سکتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کا ہندی میں ترجمہ کر لیں۔ سولہ کہانیاں ہیں۔ آپ اطمینان سے ترجمہ کر سکتی ہیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔''

چنانچہ اس وقت تک ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست بن چکے تھے اس لیے میں نے معاوضے کی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ سوچا جب موقع مل جائے گا تو بات کر لوں گا یا پھر اختتام پر کوئی اچھا سا تحفہ دے دوں گا۔

''یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مجھے یہ کام کرنے میں خوشی ہوگی۔'' اس نے کسی پس و پیش کے بغیر میری درخواست منظور کر لی۔

''تو پھر میں اپنی کتاب کل تک آپ کے پاس پہنچا دوں گا۔ آپ ایک ایک کہانی کا ترجمہ کر لیں اور مجھے دے دیا کریں تا کہ میں اس کو پڑھ لوں اور کہیں کوئی تبدیلی کی ضرورت ہو تو بتا

دوں گا۔"

"ایسے تو بہت ٹائم لگے گا کیونکہ میں اردو روانی سے نہیں پڑھ پاتی اور سیکھے ہوئے بھی زمانہ ہو گیا ہے۔اس کے بعد کوئی واسطہ بھی تو نہ رہا۔

"پھر کہیں دونوں بیٹھ کر یہ کام کر سکتے ہیں۔میں پڑھا کروں گا اور آپ ہندی میں ترجمہ کر کے لکھا کریں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔آپ کا گیسٹ ہاؤس تو نزدیک ہی ہے۔میں ہر روز گھنٹے بھر کے لیے آیا کروں گی اور آپ ڈکٹیشن دیا کریں۔"

"بہت اچھا، آپ نے تو میری مشکل حل کردی۔مگر ایک پرابلم ہے....!"

"وہ کیا؟"

"میری اکثر کہانیاں جنسی نوعیت کی ہیں۔آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"اس میں کونسی عذر کی بات ہے۔لٹریچر میں تو سبھی طرح کے موضوعات ہوتے ہیں۔ میں نے نہ جانے کتنی جنسی کہانیاں پڑھ لی ہوں گی۔آپ فیصلہ کر لیجیے کہ کس طرح یہ کام آسانی سے روبہ عمل لایا جا سکتا ہے، میں ترجمہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

ان دنوں میں نرائن پور میں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں اکیلا رہتا تھا کیونکہ کورٹ میں میری طلاق کا کیس چل رہا تھا۔دونوں بچے ہوسٹلوں میں رہتے تھے۔کومل آدھا پون کلومیٹر دور ایک کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ دفتر بند ہونے کے بعد وہ ایک گھنٹے کے لیے گیسٹ ہاؤس آیا کرے گی اور میں کہانی پڑھتا رہوں گا اور وہ ترجمہ کرتی رہے گی۔

انتظام اچھا تھا۔میں کہانیاں پڑھتا گیا اور وہ ترجمہ کرتی گئی۔ ہندی، اردو اور انگریزی کے چار پانچ لغات بھی دستیاب تھے۔کبھی کبھار کسی ٹھیٹ اردو لفظ کا متبادل لفظ نہیں ملتا تھا یا پھر کسی متبادل لفظ پر ہماری سہمتی نہیں بن پاتی تھی، اس وقت ان لغات کی ضرورت پڑتی تھی۔کبھی کبھی کسی

لفظ کا لغوی معنی میرے من کو نہیں بھاتا تھا، اس لیے ان لغات کی مدد سے مترادف الفاظ ڈھونڈ کر ایسا لفظ چننے کی کوشش کی جاتی جو میرے خیال کا صحیح ترجمان ہوتا۔ ترجمے کا یہ مرحلہ بہت کٹھن تھا۔ کہاں تو میں نے سوچا تھا کہ سولہ کہانیاں سولہ دنوں میں ختم ہو جائیں گی اور کہاں ایک ایک کہانی کا ترجمہ کرنے میں پورا ہفتہ لگ رہا تھا۔ مجھے کومل کی لگن اور اس کی دیانت داری نے بہت متاثر کیا کیونکہ اس نے کبھی تھکن یا بوریت ظاہر نہیں کی اور انہماک سے ترجمہ کرتی رہی۔

کہانیاں ترجمہ کرتے وقت وہ میری کہانیوں کے کرداروں سے اپنے وجود کی تطبیق کرنے لگی۔ اسے کہانیوں کے کئی کرداروں نے بہت متاثر کیا۔ ان کرداروں میں اسے کچھ اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً میں چائے بنا کر لے آتا اور دونوں تھکاوٹ دور کرنے کے لیے چائے نوش فرماتے۔ اس دوران وہ مجھ سے کسی کردار کے بارے میں کئی سوال کرتی جیسے وہ مخصوص کردار مجھے زندگی کے کس موڑ پر ملا تھا، دونوں ایک دوسرے کو کس حد تک جاننے لگے تھے اور پھر اس رشتے اور کردار کا کیا حشر ہوا؟ میں بھی بغیر کسی لاگ لپٹ کے اس کردار سے ہوئی ملاقات اور رشتے کے بارے میں ساری روداد سناتا۔ اس طرح کومل کو اتنا تو معلوم ہوا کہ میں شفاف شخصیت کا مالک ہوں اور میری کہانیوں کے اکثر کردار میری زندگی کے اہم جزو رہے ہیں اور پھر بچھڑ کر میرے افسانوں میں امر ہو چکے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس کے من میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ وہ بھی ان کرداروں کی طرح ہی قرطاس پر پھیل کر امر ہو جائے۔ وہ خود کو میری کہانیوں کے کردار کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی اور اس حوالے سے کئی بار سوال بھی کیے۔

’’آپ مجھے کہانی کے کردار میں کب ڈھالیں گے؟‘‘

’’میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔‘‘

’’میرا مطلب ہے کہ آپ کی زندگی میں جو بھی لڑکی آئی، آپ کی کہانی کا حصہ بن گئی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں بھی کبھی اس داستاں کا حصہ بن جاؤں گی۔ ہماری دوستی میں بھی تو بہت

عرصہ گزر گیا۔"

"میں نے اس طرف کبھی کوئی دھیان نہیں دیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آپ کے ساتھ میرے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔ آپ بہت اچھی ہیں اور آپ نے یہ کام منظور کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے مگر میں نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ کبھی آپ کا مشاہدہ بہ دل و جان کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"کیا میری شخصیت میں اتنی جاذبیت نہیں ہے کہ آپ متوجہ نہ ہو سکے؟ لگتا ہے آپ نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ میں آپ کی کہانیوں کا کردار بن سکوں۔" اس نے سیدھا سپاٹ سا سوال کیا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ دراصل میری کہانیوں میں آپ کو جو بھی کردار ملیں گے وہ میرے بہت قریب رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھ بہت مدت تک وابستہ رہے، اٹھتے بیٹھتے رہے، گفتگو کرتے رہے اور....! میں نے ان کی شخصیت کو جانچا ہے، پرکھا ہے اور پھر اپنے افسانوں میں ڈھالا ہے۔ آپ میری اچھی دوست ہیں اور دوستی کی مقدس لکشمن ریکھا میں نے کبھی پھلانگنے کی کوشش نہیں کی۔"

اس روز کے بعد وہ معمول کی طرح آتی رہی اور اپنا کام کر کے چلی جاتی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں وہ والہانہ پن غائب ہو گیا تھا جو پہلے نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود کومل نے کنایتاً کئی بار اپنی آرزو کا مکرر اظہار کیا مگر میں نے ہر بار اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ انسان سماجی شعور کے باعث کبھی غیر ارادی طور پر کچھ حدبندیوں میں جکڑ جاتا ہے اور پھر اس میں سے نکل نہیں پاتا۔

ایک روز وہ نہیں آئی۔ میں بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ جب انتظار کی گھڑیاں برداشت سے زیادہ بڑھ گئیں تو میرے دل کو وسوسوں نے گھیر لیا۔ میں سوچنے لگا۔ "ہو سکتا ہے بیمار پڑ گئی ہو۔

یوں بھی خواتین کو دو تین دن پریشانی کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر لگتا ہے کہ کچھ زیادہ پرابلم ہے ورنہ ضرور ٹیلیفون پر اطلاع دیتی۔ پھر اکیلی بھی تو ہے۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں ہے۔''

میں خود ہی اس کے گھر چلا گیا۔ میرا اندیشہ صحیح نکلا۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سر میں دوپٹہ باندھ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپ کیسے آئے؟''

''آپ آج آئی نہیں، مجھے فکر ستانے لگی۔ سوچا پتا کر لوں کہ کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ آپ اکیلی ہیں۔ بیمار بھی تو پڑ سکتی ہیں۔ پھر یہاں آپ کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی بھی تو نہیں ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ دفتر سے واپسی پر سر میں کچھ درد سا ہونے لگا اس لیے میں نے لیٹنا ہی مناسب سمجھ لیا۔''

''کچھ دوائی شوائی لے لی ہوتی؟''

''نہیں۔ ابھی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔''

''کم سے کم وِکس مل لیا ہوتا۔ کچھ راحت محسوس ہو جاتی۔ اگر گھر میں نہیں ہے تو میں بازار سے لے آؤں۔''

''ہاں یہ ٹھیک مشورہ ہے۔ آپ زرا میری الماری کھول کر وِکس کی شیشی نکال لیں۔ شاید کچھ افاقہ ہو۔''

میں نے الماری کھولی اور وِکس کی شیشی نکالی اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ''آپ لیٹ جاؤ، میں لگاتا ہوں۔''

میں اس کے پلنگ پر چڑھ کر دوزانو بیٹھ گیا اور اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ بائیں ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی پکڑ لی اور دائیں ہاتھ سے بام نکال کر اس کے ماتھے پر بڑی ملائمت سے ملنے

لگا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا سر بھی دباتا رہا۔ وہ آنکھیں بند کر کے یک گونہ راحت سی محسوس کر رہی تھی ۔ شاید اس کو کچھ اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے بلا ارادہ میرے بائیں ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں ۔ بہت دیر تک میں اس کے ماتھے اور سر کو دباتا رہا اور پھر نہ جانے کیسے میرا بائیاں ہاتھ سرک کر اس کی چھاتی تک پہنچ گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولی۔ میرا ہاتھ بدستور تھامے رہی ۔ شاید وادیوں کی اس کھوج میں اسے بھی لذت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے سپنوں کی دنیا میں کھو گئی۔ دونوں کے لب خاموش تھے۔ کوئی کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ وقت کیسے بیت گیا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ اچانک میری نظر دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی پر پڑی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ اس نے ابھی تک کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔ اس لیے بول اٹھا۔

''ڈنر کے لیے کیا انتظام ہے؟''

''ڈنر کھانے کو جی نہیں کرتا۔ اگر آپ کھائیں گے تو ہوم ڈیلوری سے منگواؤں گی۔''

میں نے ہامی بھر لی۔ اور اس نے جلدی سے ٹیلی فون کر کے ہوم ڈیلوری سے کھانا منگوایا ۔ آج نہ جانے کیوں ڈنر کھانے میں عجیب سا لطف آ رہا تھا۔ بہت دنوں بعد کسی کے ساتھ ایسی یگانگت سے بیٹھ کر کھانے کا مزہ کچھ اور ہی لگ رہا تھا۔ پھر ڈنر ختم ہوتے ہی میں نے اجازت لے لی ۔ وہ بستر سے اتر کر نیچے صدر دروازے تک مجھے چھوڑنے آئی اور میرے قریب کھڑے ہو کر مجھے پیاسی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ بدن سے ایک عجیب سی شعاع ریزی ہو رہی تھی ۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر اس کی کمر میں اپنے بازو حمائل کر دیے اور اس کے لب چوم لیے۔ وہ بہت دیر تک میرے ساتھ جنگلی چھپکلی کی طرح چمٹ کر کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد میں پیچھے ہٹ گیا اور پھر بوجھل قدموں سے گیٹ کے باہر نکل گیا۔ وہ مجھے تب تک دیکھتی رہی جب تک میں آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا۔

ہماری نزدیکیاں روز بروز بڑھتی گئیں اور ترجمہ کاری کی رفتار سست ہوتی رہی۔ ترجمہ کرتے کرتے اکثر میری آنکھیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتیں۔ اور الفاظ حلق میں یوں اٹکنے لگتے جیسے زبان کسی خاردار جھاڑی میں پھنس گئی ہو۔ متن میں سے اس کا وجود ابھر آتا اور کانوں میں اس کی سانسوں کا زیر و بم سنائی دیتا۔ وہ دھک دھک کرتا ہوا سینہ، وہ خمار بھری آنکھیں، وہ رس بھرے ہونٹ میرا تعاقب کرتے اور کتاب کو میز پر الٹا رکھ کر میں اس کو بھینچنے کے لیے پریشاں ہو جاتا۔ شاید اس کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی آنکھیں غلافی ہو جاتیں، چہرہ تمتما اٹھتا اور انگلیوں میں ارتعاش پیدا ہوتا۔

اب تو میرا اس کے گھر آنا جانا معمول بن چکا تھا۔ وہ ہر اتوار کو میرا انتظار کرتی اور میں دن بھر اسی کے پاس بیٹھا رہتا۔ کوئی ترجمہ نہیں، کوئی لٹریچر نہیں۔ بس صرف باتیں ۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اپنی زندگی کے اوراق الٹ پلٹ کرتے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کتنا بڑا خزانہ تھا جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساجھا کرتے۔ اور پھر لنچ یا ڈنر۔ کبھی اس کے ہاتھ کا بنا ہوا اور کبھی ہوم ڈیلوری کا۔ اور پھر چائے یا کوفی اور ساتھ میں بسکٹ۔ دن بھی نہ جانے کیسے بھاپ بن کر اڑ جاتا۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں جھول کر وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔

مجھے اتنا تو یقین تھا کہ یہ لڑکی کچھ سنکی سی ہے۔ میرے علاوہ بھی اس کے کئی دوست تھے مگر کس سے کیا رشتہ تھا میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اس کے خیالات سے اس کی شخصیت کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ آزاد پنچھی کی طرح اڑان بھرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اسے اپنی آزادی بہت پیاری تھی۔ اپنے دوستوں سے جب بھی وہ ٹیلی فون پر بات کرتی تھی یوں لگتا کہ وہ ان سے دل لگی کر رہی ہے، ان کو غیر ضروری ملحقات سمجھتی ہے جیسے وہ کھلونے ہوں، کھیل کر دور پھینک دینے یا پھر اپنی الماری میں مستقبل کے لیے اٹھا کر رکھنے کے لیے۔ دوستوں کے ٹیلی فون

آتے تو کبھی فوراً اٹھا لیتی اور کبھی اٹھاتی ہی نہ تھی جب تک وہ بے چارہ تھک کر خود ہی اس کی تلاش بند کر دیتا۔ مجھے اس کی یہ عادت انوکھی لگتی۔ اس لیے جب کبھی میں اس کو ٹیلیفون کرتا، اگر گھنٹی دو تین بار بجتی اور وہ ریسیور نہیں اٹھاتی، میں خود ہی سمجھ لیتا تھا کہ اس کو بات کرنے کا موڈ نہیں ہے یا وہ کسی دوسرے دوست کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہے۔ اس لیے چپ چاپ ٹیلی فون رکھ دیتا۔

انھی دنوں عدالت نے میری طلاق منظور کر لی۔ اس لیے میں کسی اور شریک حیات کی تلاش میں تھا۔ میں نے سوچا کہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں کومل کے سامنے شادی کی تجویز رکھ لوں حالانکہ متوقع جواب سے بھی باخبر تھا۔ تاہم میں موقع پا کر اس سے مخاطب ہوا۔

''کومل، میری طلاق منظور ہو چکی ہے۔ تم اگر مناسب سمجھ لو تو ہم دونوں شادی کر سکتے ہیں۔''

کمرے میں اس کا قہقہہ گونجا۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ''شادی....! لگتا ہے آج کچھ بھنگ پی کر آئے ہو۔''

''کیوں کبھی تو تمھیں شادی کرنی ہی پڑے گی۔ عمر بھی بہت ہو چکی ہے۔ پھر کب کرو گی۔'' مجھے اپنی اور اس کی عمر کے تفاوت کا احساس تھا مگر چنانچہ ہم دونوں کافی گھل مل گئے تھے اس لیے میں نے سوچا کہ شاید وہ راضی ہو جائے۔

''میں نے کبھی شادی کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔'' وہ بولی۔

''شادی تو ایک نہ ایک روز کرو گی ہی۔ عورت ہو۔ کسی کے سہارے کی ضرورت تو پڑے گی۔ آخر یہ جوانی تو ہمیشہ ساتھ دینے سے رہی۔ پھر اس وقت کہاں جاؤ گی۔ کوئی تو ساتھ ہونا چاہیے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں اور ایک دوسرے کی اچھائیوں اور برائیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔''

''تم نے بھی تو شادی کی تھی۔ کہاں ہے وہ تمھاری رفیقۂ حیات؟ اس نے بھی تو یہی سوچ

کر شادی کی ہوگی کہ بڑھاپے کا سہارا مل جائے گا۔ اب طلاق کے بعد کون اس کا ساتھ دے گا۔ اور پھر تم بھی تو اکیلے پڑ گئے۔ تمھارے بڑھاپے میں کون تمھارا ساتھی ہوگا؟ جیسے تم جیو گے ویسے ہی میں بھی جیوں گی۔ اور پھر مان لو میں کسی سے شادی کر بھی لوں اور وہ چند سال کے بعد مر جائے، پھر اس وقت میرا کیا ہوگا؟''

''تب تک تمھارے بچے ہوں گے۔ وہ تمھارا سہارا بنیں گے۔''

''کیا ضروری ہے کہ میرے بچے ہوں گے۔ اور اگر ہوں گے بھی تو کیا ضروری ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی رہیں گے۔ کتنی مثالیں دے سکتی ہوں جہاں اولاد نے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ دیا اور وہ تنہا رہ گئے۔ پھر کیوں میں ان چند ساعتوں کے عدم تحفظ کی خاطر اپنی جوانی کی طویل گھڑیاں قید و بند میں ضائع کرلوں۔''

''تمھارے خیالات انوکھے ہیں۔ نارمل لگتے ہی نہیں۔''

''نارمل ہوتی تو تم میرے ساتھ اس وقت یہاں نہیں ہوتے۔ میں کسی کے کچن میں بھاڑ جھونک رہی ہوتی۔ ایک بات کہوں۔ حیران تو نہیں ہوگے۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں، کہہ دو۔''

''میں اپنے بیڈ روم میں کسی دوسرے شخص کا تصور کر ہی نہیں سکتی۔ میں کسی کو اپنی پرائیویسی کا شریک بنانے کی سوچ بھی نہیں سکتی۔ مجھے ایسا لگے گا کہ کوئی جیلر دن رات میری رکھوالی کر رہا ہے۔ میں اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتی۔''

میں اپنی حماقت پر پشیمان ہوگیا۔ ماحول میں عجیب سے مایوسی چھا گئی۔ دل میں پچھتانے لگا کہ میں نے یہ پروپوزل رکھا ہی کیوں۔ خیر اب تو کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ اب اس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ خفا ہوئی ہوگی اور اب جانے میں ہی میری خیریت ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس نے معمول کی طرح ہوم ڈیلوری سے کھانا منگوایا اور پھر ہم دونوں نے اسے

نوش فرمایا۔ حالانکہ آج مجھے کچھ ہچکچاہٹ سی ہو رہی تھی مگر اس کے وتیرے میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیا۔ وہ پہلے جیسی ہی تیز طرار، زندہ دل، اور خوش طبع نظر آ رہی تھی۔

ہماری دوستی پرانی ڈگر پر اسی رفتار کے ساتھ چلتی رہی جب تک اس کا ٹرانسفر آرڈر آ گیا۔ اس کو ترقی مل گئی اور نہ صرف وہ بلکہ میں بھی بہت خوش ہوا۔ پھر اس کے جانے کا دن آ گیا۔ دن گیا، جانے کی ساعت آ گئی۔ کمرے میں سارا سامان پیک کر کے بکھرا پڑا تھا۔ فرنیچر، کچن کا سامان، کتابیں، ٹی وی، میوزک کا سامان وغیرہ۔ اس کو رخصت کرنے کے لیے اس کے سارے دوست ریلوے سٹیشن پر انتظار کر رہے تھے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ لیکن میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ میرے بعد اس کا ایک اور دوست چلا آیا جس کو اس نے ٹرک میں سامان بھجوانے کی ذمے داری سونپی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی وہ تلملا اٹھی۔ وہ یہ چند لمحے گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کچھ بہانا بنا کر اس دوست کو دوبارہ کسی کام سے مارکیٹ بھیج دیا۔ اس کے جاتے ہی وہ جلدی جلدی کمرے کے اندر آ گئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ مجھ پر محبتوں کی برسات کرنے لگی۔ کمرے کا سماں دیکھ کر مجھے اس کی اس وحشت پر حیرت ہو رہی تھی۔ مگر وہ تھی کہ اس گھڑی کو یادگار بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس کا دوست لوٹ آیا اور ہم تینوں اسی کی کار میں ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں دوستوں کے سبب ہمارے بیچ کوئی مزید بات نہیں ہو سکی۔ صرف گاڑی کے چلتے ہوئے میں بے دلی سے اپنا ہاتھ ہلاتا رہا۔

شاید اس کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے یا پھر اگر کبھی کبھار مل بھی گئے تو وہ پہلی سی بات نہیں بنے گی کیونکہ اب تک اس کو میرے کردار کی واقفیت پوری طرح ہو چکی تھی۔ البتہ اسے اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس کا کردار میری کہانی میں ایک نہ ایک دن ضرور نقش ہو جائے گا۔

جاگتی آنکھوں کے خواب

آرزوؤں کی اُڑان کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ نہ مالی حالت دیکھتی ہے اور نہ سماجی رتبہ۔ شعبان ڈار کی دِلی آرزو تھی کہ اس کے دونوں بیٹے، خالد اور اشتیاق ڈاکٹر بن جائیں۔ دراصل ان دنوں اکثر والدین اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ ان پیشوں کے علاوہ کچھ سوجھتا بھی نہ تھا۔ خود شعبان ڈار سونم پورہ ہائر سیکنڈری سکول میں بیالوجی ٹیچر تھے۔ اس کے تحت تعلیم پائے ہوئے کئی طلبہ ڈاکٹر بن چکے تھے۔ ان سے کبھی کبھار اتفاقاً سامنا ہو جاتا تو شعبان ڈار کی چھاتی گز بھر کی ہو جاتی۔ استاد کی فطرت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اپنے طالب علم کو ترقی کرتا دیکھ کر پھولا نہیں سماتا ہے۔ شعبان ڈار اپنے بچوں کے لیے بھی دعائیں کرتا کہ دونوں ڈاکٹر بن کر اس کا نام روشن کریں۔ آخر کار خدا نے اس کی سن لی۔ دونوں لڑکے پانچ سال کی وقفے سے ایک کے بعد ایک میڈیکل کالج میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ شعبان ڈار شکم سیر ہوا اور اب اسے مزید کچھ مانگنے کی ضرورت نہ تھی۔ روزانہ صبح وشام خدا کا شکر بجالاتا۔

بڑا لڑکا خالد محمود بہت ہی ذہین تھا۔ اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے پر ایم بی بی ایس میں امتیازی نمبر حاصل کر کے چند مہینے گورنمنٹ ہسپتال میں ملازم ہو گیا۔ وہاں جتنی دیر رہا، آتش زیرپا رہا۔ پھر بنک سے تعلیمی قرضہ لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکا چلا گیا۔ تعلیم مکمل کرتے ہی وہاں اچھی نوکری ملی اس لیے امریکا کو ہی مستقر بنالیا۔ سال میں ایک بار چھٹی مل جاتی تو والدین کی خیر خبر لینے چلا آتا اور وقتاً فوقتاً مالی اعانت کرنا اپنا فرض سمجھ لیتا۔ لیکن کچھ مدّت کے بعد حالات نے عجیب سی کروٹ لے لی۔ اس نے امریکا ہی میں شادی کر لی اور اپنی بیوی کے ہمراہ چھٹیاں

منانے کے لیے کشمیر چلا آیا۔ ابتدا میں خالد کی یہ کوشش رہی کہ بیوی گھر کے ماحول میں ڈھل جائے مگر جب اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی کو وہاں کی ہوا راس نہیں آئی تو گرینڈ پیلس ہوٹل میں منتقل ہوا۔ دونوں کے شب و روز زیادہ تر دور دراز صحت افزا مقامات جیسے پہلگام، گلمرگ، سونمرگ، کوکر ناگ، یوس مرگ وغیرہ ہی میں گزرنے لگے تا کہ والدین سے کوئی تعامل نہ رہے۔ البتہ جاتے وقت والدین کے پاس حاضری دی اور انھیں کچھ روپے دینے کی کوشش کی مگر والد نے صاف انکار کر دیا۔ خالد کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ماضی میں جو رقوم اس نے اپنے والد کو دی تھیں وہ سب تعلیمی قرضے کو اتارنے کے لیے اسی کے بنک کھاتے میں جمع ہو چکی ہیں۔ الوداع کہتے وقت سوزش دل کے سبب ماں کی آنکھوں میں کہرا اٹھتا رہا پھر بھی اس نے ضبط کا دامن نہیں چھوڑا۔

اِدھر چھوٹے بھائی، اشتیاق احمد نے بھی ڈاکٹری کا امتحان پاس کر لیا اور ان ہاؤس ٹریننگ کرنے کے بعد سرکاری ہسپتال ہی میں تعینات ہوا۔ بڑے بھائی کے چلے جانے کے بعد گھر کی دیکھ ریکھ کی ذمے داری اس کے سر پر آن پڑی تھی اور وہ اسے بخوبی نبھاتا رہا۔ کم سے کم اسے اس بات کی تسلی تھی کہ کالج میں جس لڑکی کو دل دے بیٹھا تھا وہ کشمیری ہے۔ شاہینہ ملکۂ حسن تھی۔ اسے دیکھ کر گل لالہ بھی شرما جاتا۔ گوری، سڈول، خم دار، نازک خرام اور خوش گفتار۔ بڑے نازوں کی پلّی تھی۔ راج باغ میں اس کے والدین کا تین کنال زمین پر ایک خوبصورت بنگلہ تھا۔ بنگلے کے سامنے رنگا رنگ پھولوں اور پھل دار درختوں سے مزّین بہت بڑا باغ تھا۔ اشتیاق خود کو بہت ہی قسمت والا سمجھ رہا تھا۔ عشق ایسی چیز ہے جو آدمی کی آنکھوں پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس کے سوچنے کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ اشتیاق کو اپنی معشوقہ کے سوا دنیا میں اور کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔

شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ چنانچہ شاہینہ والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اس لیے والد نے روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔ لیکن شادی کے فوراً بعد دونوں گھروں کے درمیان کی خلیج سامنے آئی۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ شادی کے کچھ ہی مہینے بعد شاہینہ اس بات پر مصر تھی کہ

دونوں اس کے میکے کے مکان میں شفٹ ہو جائیں۔اشتیاق کے پوچھنے پر کہ ابا اور امّی کا کیا ہوگا اس نے جواب دیا۔ ”وہ بھی ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں۔وہاں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔“

شعبان ڈار اور نسیمہ نے اپنے بیٹے اور بہو کی تجویز یک لخت ٹھکرائی۔ایک تو یہ کہ جس مکان میں وہ رہ رہے تھے، اس کو بیس برس پہلے انھوں نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے از سرِ نو تعمیر کیا تھا۔وہ ان کی محبت کا شیش محل تھا۔دوسرے یہ کہ شعبان ڈار انانیت پسند اور خوددار آدمی تھا۔اس نے پوری زندگی قناعت سے گزاری تھی اور کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔اسے بچوں کی اس تجویز میں اپنی انا کی تحقیر نظر آ رہی تھی۔دوٹوک جواب دیا۔

”اشتیاق، جب تک ہم زندہ ہیں، اس آبائی جگہ کو نہیں چھوڑیں گے۔یہاں ہمارے پُرکھوں کی اساس ہے۔یہ ہمارے لیے متبرک ہے۔تمھارا بڑا بھائی فرنگن کے ساتھ امریکا میں جا بسا، ہم نے کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا۔تم نے اپنی مرضی سے شادی کی، ہم نے تمھاری بات بھی مان لی کیونکہ وہ تمھاری نجی زندگی کا فیصلہ تھا۔مگر میری یہ درخواست ہے کہ ہماری زندگی میں دخل دینے کی کوشش نہ کرو۔ہم اپنا بُرا بھلا جانتے ہیں۔ہم سے ہماری آزادی مت چھین لو۔“

جواب سن کر اشتیاق اور شاہینہ گھر چھوڑ کر راج باغ منتقل ہو گئے اور وہیں گراونڈ فلور میں تین بیڈ کا نرسنگ ہوم کھول دیا۔مہینے کے آخر میں اشتیاق خیریت پوچھنے اور کچھ روپے دینے کے لیے اپنے والد کے سامنے حاضر ہوا۔والد نے پھر اسی ترشی سے اسے ٹھکرا دیا۔

”بیٹے، میں نے تمھارے بڑے بھائی کو بھی منع کر لیا اور تمھیں بھی کرتا ہوں۔میں اور نسیمہ دونوں معقول پنشن پاتے ہیں جو دو نفوس کے لیے ضرورت سے زیادہ ہے۔خدا ہم پر ہمیشہ مہربان رہا ہے۔خدانخواستہ کبھی ہم پر کوئی مصیبت آ جائے اور ہم دوسروں کے رحم و کرم کے محتاج ہو جائیں۔پھر بھی اگر ایسا ہوا تو اپنے بچوں سے نہ مانگیں گے تو کس کے پاس ہاتھ پھیلائیں گے۔تم اطمینان رکھو۔“

جواب سن کر اشتیاق کھسیانا ہو گیا۔ روپے واپس کوٹ کی جیب میں ڈال دیے اور اپنا سا منہ لے کر لوٹ گیا۔ اس روز کے بعد اس کا چہرہ خال خال ہی نظر آنے لگا۔ یہ وہی دن تھے جب کشمیر میں دہشت کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ ہر طرف شور وغل، آہ وزاری اور نالہ وفریاد سنائی دے رہی تھی۔ فضا میں بارود کی بو بس گئی تھی۔ کبھی سرکار کی طرف سے کرفیو یا جامہ تلاشی کا اعلان ہوتا اور کبھی حریت پسند تنظیمیں سول کرفیو، ہڑتال یا پھر بندھ کا اعلان کرتیں۔ بیچ میں عوام پس کر رہ جاتی ۔غریب لوگوں کا کیا، وہ جس طرف پلڑا بھاری دیکھتے ہیں اسی طرف رخ کرتے ہیں۔ وہ نہ سرکار کے منہ لگنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور نہ ہی دہشت پسندوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انھیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ جان بچی تو لاکھوں پائے۔

ہر روز کہیں بم پھٹنے کی خبریں ملتیں، کہیں گولیاں چلتیں اور کہیں ٹیئر گیس کے گولے داغے جاتے۔ درجنوں لوگ زخمی ہو جاتے اور ان میں سے چند ایک دم توڑ دیتے۔ ملی ٹنٹوں کی حکمت عملی یہ رہتی کہ کسی گلی کوچے سے نکل کر لوگوں کی بھیڑ میں گھس جاتے اور فوجی بنکروں پر یا تو ہتھ گولے پھینک دیتے یا پھر گولیاں برساتے۔ جب تک مکافاتی کارروائی ہوتی، وہ منظر سے غائب ہو جاتے ۔فوجی کارروائی میں جو گولیاں چلتیں ان سے عموماً معصوم شہری مر جاتے اور اس بات کو حریت پسند تنظیمیں انسانی حقوق کے تحت اچھالنے میں کامیاب ہو جاتے۔ دہشت گردی کے ابتدائی دور میں انتظامیہ ٹھپ ہو گیا اور نظام کا کچھ حصہ ان تنظیموں کے قبضے میں آ گیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ سیکورٹی فورسز کو پسپا کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اور اب آزادی بہت دور نہیں۔ اِدھر دہشت گردوں کی وارداتیں بڑھتی گئیں، اُدھر سیکورٹی فورسز کے پکٹوں اور بنکروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری وادی فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہو گئی۔ ناکہ بندی، جامہ تلاشیاں اور حراستیں معمول بن گئیں۔ ان غیر یقینی حالات کو دیکھ کر طبقۂ اشرافیہ وادی چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ تجارت پیشہ لوگوں نے دہلی، ممبئی ،کولکتہ اور خلیجی ممالک میں اپنی دکانیں کھول دیں جبکہ پیشہ ور لوگوں، خاص کر ڈاکٹروں، نے یورپ

ممالک اور امریکا کا رخ کر لیا۔ وادی میں بس نام کے ڈاکٹر رہ گئے۔ جن ڈاکٹروں کو پہلے کوئی گھاس تک نہیں ڈالتا تھا وہ سپیشلسٹ کہلانے لگے۔ تنظیمی سربراہوں کی خوشنودی کے لیے انھوں نے ہفتہ میں ایک دن غریبوں کو مفت علاج کرنے کے لیے مختص کر لیا۔ مریضوں کے نسخوں پر ٹیسٹ اور ادویات کے نام لکھتے لکھتے کہیں کوئی جگہ نہیں بچ پاتی۔ دس بارہ دوائیاں اور دو تین ٹیسٹ لکھ دیے اور تین چار سو بطور کمیشن کما لیے۔ پھر مشورے کی فیس لینے کی کیا ضرورت تھی۔

اشتیاق اور شاہینہ کو یہ سب راس نہ آیا۔ خالد سے رابطہ کر کے وہ بھی امریکا جا کر نوکری کرنے لگے۔ یہاں وادی کے حالات روز بروز بگڑتے چلے گئے جس کی خبریں پڑھ کر دونوں بھائیوں نے چھٹی کے ایام میں کشمیر آنا ترک کر لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شعبان ڈار اور نسیمہ کی صحت گرنے لگی تاہم دونوں خدا کی عبادت میں اپنا بیشتر وقت صرف کرتے رہے۔ شعبان ڈار مسجد میں اور نسیمہ گھر پر ہی پنجگانہ نماز ادا کرتی۔ عبادت کے دوران ان کی آنکھیں خود بہ خود نم ہو جاتیں۔ اب نہ تو ان کے چہرے پر وہ پہلی سی رونق نظر آتی تھی اور نہ ہی وہ بشاشت۔

کبھی کبھی نسیمہ کے پیٹ میں درد اٹھتا مگر وہ برداشت کرتی اور اسے ظاہر نہ ہونے دیتی تاکہ اس کا ہراساں شوہر مزید پریشاں نہ ہو۔ البتہ یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ ایک روز نسیمہ شدت درد سے تڑپنے لگی اور اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ شعبان ڈار نے جلدی سے پانی پلایا اور پھر ٹیکسی منگوا کر اس کو شیر کشمیر انسٹی ٹیوٹ، صورہ لے کر گیا۔ ڈاکٹروں نے دیکھتے ہی تاسف کا اظہار کیا۔ تاہم وہ تب تک کوئی فیصلہ نہیں دینا چاہتے تھے جب تک سبھی ٹیسٹوں کے رپورٹ نہ آجاتے۔ دو تین روز میں رپورٹ آ گئے اور یہ طے پایا کہ نسیمہ کو رحم کا سرطان ہے اور وہ بھی ایڈوانسڈ سٹیج پر۔ ایک ڈاکٹر نے شعبان ڈار کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”ڈار صاحب، اس سے پہلے آپ مریض کو کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے گئے تھے؟ آپ نے تو بہت دیر کر دی ہے۔“

شعبان ڈار جیسے آسمان سے گر پڑا۔ ”کیوں کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب؟ نسیمہ نے تو اس

سے پہلے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ بس کبھی کبھار کہتی تھی کہ پیٹ میں معمولی سا درد ہو رہا ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"خبر کچھ اچھی نہیں ہے۔ اس کو وومب کا کینسر ہے۔ اور اب اوپر والا ہی بچا سکتا ہے۔"

شعبان ڈار کے جیسے لب سِل گئے۔ کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو امڈتے چلے آئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی رفیقِ حیات اس طرح دغا دے جائے گی۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں اس نے اشتیاق کی بات نہ مان کر غلطی تو نہیں کی تھی۔ اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ نسیمہ تو اس کا سایہ بن کر رہتی تھی۔ کبھی بھی اس کو تنہا محسوس نہ ہونے دیا۔ اور خود وہ بھی تو اسے بہت پیار کرتا تھا۔ اپنی جان سے بھی زیادہ۔ ایسی جوڑیاں تو دنیا میں بہت کم نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس کی خاموشی کو دیکھ کر پھر گویا ہوا۔ "ہم بہت کوشش کر رہے ہیں۔ ان کو ریڈیشن تھیریپی یا کیموتھریپی دینے پر غور کیا جا رہا ہے۔ دیکھتے ہیں کیا کارگر ہو سکتا ہے۔"

دس پندرہ روز یوں ہی گزر گئے۔ نسیمہ پنجر بنتی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں بس ایک آخری آرزو تھی کہ مرنے سے پہلے کاش وہ ایک بار، صرف ایک بار، اپنے بچوں کو دیکھ پاتی۔ نہ جانے کہاں ہوں گے؟ مگر وہ اس خواہش کا اظہار کرنے سے گھبرا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز خالد کا ٹیلی فون آیا مگر شعبان ڈار نے اپنی بیوی کے مرض کی بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ہوں ہاں کر کے موبائیل کا سوئچ آف کر دیا۔ نسیمہ چپ چاپ اپنے آنسو پیتی رہی۔

اب تو نسیمہ کی الٹی گنتی شروع ہو گئی تھی۔ سبھی ڈاکٹروں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ نرس کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ اس نیک اور پارسا عورت کو دیکھ کر اسے نسیمہ پر ترس آیا۔ شوہر کی غیر موجودگی میں نرس نے اسے پوچھ لیا۔ "نسیمہ بی بی، یہاں صرف آپ کے شوہر آتے ہیں۔ کیا آپ کے گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟"

نسیمہ کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ نرس کو یوں لگا جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو۔ اس نے

مریضہ کو ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر کے بعد نسیمہ بول پڑی۔ ''بیٹی، ہے کیوں نہیں۔ دو دو بیٹے ہیں۔ دونوں امریکا میں ہیں۔ ایک نامور آنکولوجسٹ (ماہر سرطان) ہے اور دوسرا سرجن سپیشلسٹ ہے۔ بہویں بھی ڈاکٹر ہیں۔ مگر حالات دیکھ کر دونوں یہاں سے بھاگ گئے۔ وہ اس جہنم میں نہیں رہنا چاہتے تھے۔ میرے شوہر نے انھیں روکا بھی نہیں۔ وہ تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ انھوں نے مجھے کبھی بھی بچوں کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہونے دیا۔''

''ان کو معلوم ہے کیا؟''

''نہیں سسٹر ہم نہیں چاہتے کہ وہ پریشاں ہوں۔ دنیا میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ میرا تو کیا۔ دو چار روز کی مہمان ہوں۔''

''نہیں بہن، ایسے ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ آپ کے پاس ان کا نمبر تو ہوگا۔ میں خود بات کرلوں گی۔''

''نہیں سسٹر، ڈار صاحب بہت ناراض ہو جائیں گے۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔ میں ایسے اطلاع دوں گی کہ ڈار صاحب کو بالکل شک نہ ہوگا۔''

''ٹھیک ہے سسٹر۔ وہ دراز ہے نا۔ اس میں میری ڈائری ہے۔ اسی میں نوٹ کرلیا ہے۔ مگر دیکھو سسٹر، ہوشیاری سے بات کرنا۔ اس کو پتا نہ چلے کہ میں نے تمھیں ٹیلیفون کرنے کو کہا ہے۔ اور میرے خاوند کو بھی اس بات کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے۔''

سسٹر نے اپنے موبائیل سے ڈاکٹر خالد محمود، کینسر سپیشلسٹ کا موبائیل نمبر ملایا اور اس کو بڑی ہوشیاری سے خبر دی کہ اس کی ماں کینسر سے مر رہی ہے اور زیادہ دن نہیں بچ پائے گی۔ خالد محمود کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ سوچنے لگا کہ ابو نے اتنی بڑی بات اسے کیسے چھپائی۔ خیر اس نے جلدی سے اشتیاق کو بھی خبر کردی اور دونوں دوسرے دن دہلی کے لیے روانہ ہوگئے اور وہاں سے کشمیر بذریعہ طیارہ پہنچ گئے۔

اِدھر نسیمہ اس تذبذب میں تھی کہ اس نے صحیح قدم اٹھایا یا نہیں؟ تین دن اسی اضطراب میں گزر گئے اور اس کی آنکھیں دروازے کی جانب لگی رہیں۔ اُدھر ہوائی اڈّے پر پہنچ کر دونوں بیٹے براہ راست صورہ ہسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہسپتال پہنچ کر انھوں نے ریسپشن سے نسیمہ کا روم نمبر معلوم کرلیا اور وہاں کی طرف چل دیے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ان کی والدہ کو سفید چادر میں لپیٹا گیا تھا اور ہسپتال کے کرمچاری اس کی لاش کو سٹریچر پر ٹرانسفر کرنے میں منہمک تھے۔ شعبان ڈار مبہوت کھڑا اپنی محبوبہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ نسیمہ اس کو چھوڑ کر چلی گئی۔

اسی روز نسیمہ کو سپردِ خاک کر کے باپ بیٹے واپس گھر پہونچے۔ شعبان ڈار کو ایسا لگ رہا تھا کہ گھر میں سے روح غائب ہو چکی ہے۔ سبھی دیواریں اس کو کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔ دوسری صبح بیٹوں نے اپنے والد سے ضد چھوڑنے کی درخواست کی اور ان کے ہمراہ چلنے کی تاکید کی۔ انھوں نے بہت سمجھایا۔ ''ابو جان، ابھی تک تو چلو آپ کی رفیقِ حیات زندہ تھی اور آپ کی دیکھ بھال کرتی تھی مگر اب آپ اکیلے ہیں، اس لیے بہتر یہ رہے گا کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ زندگی کی اونچ نیچ کا کیا بھروسہ!''

شعبان ڈار چند لمحوں کے لیے چُپ رہا اور پھر کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''نہیں بیٹے، اب تو بالکل بھی نہیں۔ وہ ہوتی تو شاید میں غور بھی کرلیتا مگر اب میں پردیس میں جا کر مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنے کے بعد نسیمہ کی قبر کی بغل میں ابدی نیند سونا چاہتا ہوں۔ اس کی رفاقت نے مجھے آج تک زندہ رکھا، آگے بھی کوئی سبیل نکل ہی جائے گی۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔''

آج پہلی بار بیٹوں کے سامنے اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

ڈاک بابو

انگریزوں کے قائدے قانون آج بھی ہمارے ملک میں رائج ہیں۔ دیوانی قانون... فوجداری قانون.... تعزیراتِ ہند.....! ہندستان ہی کیا پورے برِصغیر کی یہی حالت ہے۔ انگریزوں نے ہمارے نظام کو اتنا مسخ کر دیا کہ اب یوں لگتا ہے کہ ان سے پہلے ہندستان میں حکومتوں کا وجود ہی نہ تھا اور اگر تھا بھی تو سب کچھ من مرضی سے ہوتا رہا ہوگا کیونکہ قوانین تو بس انگریزوں نے ہی رقم کیے ہیں۔ اس پر سوچتا ہوں تو حیرت میں پڑ جاتا ہوں۔

خیر جو بھی ہو۔ ڈاک خانے کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں کہ یہ انگریزوں کی ہی ایجاد ہے۔ ڈاک خانے کے نظام کو چلانے کے لیے انگریزوں نے بیگ بند کرنے اور اس پر سُتلی باندھنے سے لے کر ڈاک خانے کی عمارتوں تک کے قواعد وضوابط کتابوں میں قلم بند کیے ہیں۔ ایک درجن کے قریب دستور العمل ہیں جو کئی انگریز افسروں نے نہایت ہی فرصت سے لکھے ہیں اور اب تک جاری و ساری ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ آزادی کے بعد جب بھی ان قواعد وضوابط کو تبدیل کرنے یا ان کی ترمیم کرنے کی کوشش کی گئی، نیا حکم پرانے حکم سے بدتر ثابت ہوا۔ حکم صادر ہونے سے پہلے اس کی درستگی کے لیے درجنوں ترمیمات ایشوع کی جاتی ہیں۔ مقامی اختراع پسندی اور زیرکی کی ایک مثال پیش کروں تو زیادہ موزوں رہے گا۔ بہت برسوں کی ماتھا پچی کے بعد یہ طے ہوا کہ معائنے کے سوالنامے کو، جو چار سو سوالات پر مشتمل تھا، کم کرنا چاہیے۔ غرض یہ تھی کہ یو پی ایس سی کے ذریعے پاس ہوئے اعلیٰ افسروں کو بہت دیر تک گندے اور حبس زدہ ڈاک خانوں میں بیٹھنا نہ پڑے حالانکہ سوالنامے کا بیشتر حصہ انسپکٹر کے حوالے کیا جاتا تھا۔ صدر ڈاک خانے میں بیٹھ کر

چار سو سوالوں کا جواب لکھنا وہ اپنے شایان شان نہیں سمجھتے تھے۔ انجام کار نیا سوالنامہ تیار کیا گیا جس میں صرف ایک سو سوالات تھے۔ آپ پوچھیں گے یہ کیسے ممکن ہو سکا؟ گھبرایئے نہیں۔ سمجھا رہا ہوں۔ مثلاً پہلے چار سوال لے لیجیے۔ ڈاک خانے کا کیش گن کر چیک کریں اور اسے اکاونٹ بک اور اپنے رَف نوٹس میں نوٹ کر لیں۔ ٹکٹوں کو گن کر دیکھ لیں، پھر گذشتہ دورانیے میں آئی ہوئی ٹکٹوں کا اندراج دیکھ لیں اور سٹاک بک سے ملا کر نوٹ کر لیں۔ منی آرڈر کا سٹاک بک چیک کر لیں اور ہیڈ آفس سے اس کی تصدیق کروالیں۔ ڈاک خانے کی سیونگ سرٹیفکیٹس چیک کریں، پھر آمد اور روانگی کا حساب دیکھ لیں اور سٹاک رجسٹر سے ملا لیں۔ اس کے بعد پوری لسٹ ہیڈ آفس کو بھیج دیں۔ ان چار سوالوں کو ایک ہی دھاگے میں یوں پرو دیا گیا۔ آفس کا کیش، ٹکٹیں، منی آرڈر اور سیونگ سٹوفکیٹ چیک کر لیں اور دیکھیں کہ ان کی تعداد صحیح ہے یا نہیں، پھر اپنے تاثرات درج کر کے لسٹ جانچ پڑتال کے لیے اکاونٹ آفس کو بھیج دیں۔ دیکھا آپ نے زیرک افسروں کا کمال۔ چار کا ایک کیسے کر دیا۔ اس طرح چار سو کا سوال نامہ ایک سو کے سوالنامے میں سمٹ کر رہ گیا۔ ماضی میں اگر کہیں معائنے کے بعد کسی فراڈ کا انکشاف ہوتا تھا تو معائنہ کرنے والے افسر پر بھی ذمے داری ڈال دی جاتی تھی مگر روز روز کی ان ترمیموں نے افسروں کو ایسی ذمے داری سے بری کر دیا اور ڈاک خانوں میں غبن اور خیانت کی وارداتیں بڑھتی چلی گئیں۔ یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ ایسے چمتکار تو ہمارے افسر ہی کر سکتے ہیں جو، چاہے وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، خود کو وی آئی پی سمجھتے ہیں۔

میں بھی اسی گروہ کا رکن تھا۔ ان دنوں انسپکٹری کی تربیت پا رہا تھا۔ ایک روز مقامی انسپکٹر کے ہمراہ لکھنؤ شہر سے دس پندرہ کلو میٹر دور ایک گاؤں کے ڈاک خانے کا معائنہ کرنے چلا گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ٹرین میں بیٹھا تو گرم ہوا کے تھپیڑے بدن کو ٹکورنے لگے۔ دور دور تک کسی پرند و چرند کا نام و نشان بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جدھر آنکھ پڑتی تھی پیڑ پودے مرجھائے نظر

آرہے تھے۔ کہیں بھولا بھٹکا کوئی آدمی دکھائی بھی دیتا، بے چارا قسمت کو کوستا ہوا چلا جارہا تھا۔ کرتا بھی کیا؟ روزی روٹی جو کمانا تھی۔ ہم ٹرین سے اترے اور سٹیشن سے باہر نکل آئے۔ سامنے ایک میل اوورسیر دو سائیکل لے کر کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''سر، اس گرمی میں یہاں سے پیدل جانا تو ممکن نہیں ہے۔ دو کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ میں برانچ پوسٹ ماسٹر (بی پی ایم) اور ایکسٹرا ڈیپارٹمنٹل ڈیلوری ایجنٹ (ای ڈی ڈی اے) کے دو سائیکل لے کر آیا ہوں، آپ ان پر گاؤں پہنچ جائیے، وہاں پوسٹ ماسٹر انتظار کر رہا ہے۔ میں بھی تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گا۔''

میں نے ایک نظر انسپکٹر کے چہرے پر ڈال دی جو مجھے راستے میں اخلاق اور دیانت داری کے اصول سمجھا رہا تھا۔ وہ میرا ردِ عمل سمجھ کر فوراً گویا ہوا۔ ''سر لے لیجیے ایک سائیکل، یہاں تو اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔ یہاں آپ کو کوئی سواری نہیں ملے گی۔''

میں ایک سائیکل لے کر اس پر سوار ہو گیا۔ طالب علمی کے دن یاد آ گئے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پھر سے میں آزاد ہواؤں میں اپنی دھن میں آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا ہوں۔ ان دنوں نہ تو اخلاق کی فکر ہوتی تھی اور نہ ہی ضابطوں کی۔ نہ کمانے کی چنتا ہوتی تھی اور نہ ہی پس انداز رکھنے کی۔ بس لمحے بھر کے لیے جینے کی آرزو ہوتی تھی۔ جیسے تیسے دو کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا۔ راستے میں انسپکٹر سے کوئی بات نہیں ہوئی کیونکہ میں دوبارہ پائی ہوئی وہ کھلنڈری کھونا نہیں چاہتا تھا۔

جونہی ہم گاؤں کے اندر داخل ہوئے، برانچ پوسٹ ماسٹر، سر پر ڈھاٹا باندھے ہوئے، ایک بڑے سے نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ کافی عمر تھی اس کی۔ مجھے تو وہ ستر پچھتر سال کا لگ رہا تھا۔ ان دنوں ڈاک خانے میں عمر کی کوئی پوچھ تاچھ نہیں ہوتی تھی۔ کہیں پر ان کے کوائف درج کر کے انھیں سنبھال کر رکھنے کا رواج نہ تھا۔ برانچ پوسٹ ماسٹری کا دھندہ دراصل ضمنی کمائی کا ذریعہ ہوتا تھا، اصل پیشہ تجارت، کھیتی باڑی یا ٹیلرنگ وغیرہ ہوتا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں استادوں کو یہ کام سونپا جاتا تھا کیونکہ وہ پڑھے لکھے ہوتے تھے مگر آزادی کے بعد گورنمنٹ نے

استادوں کو زائد ذریعۂ آمدنی اختیار کرنے پر پابندی لگائی۔ بہت ہی قلیل مشاہرہ دیا جاتا تھا۔ البتہ بچت کھاتوں پر کچھ رقم بطور کمیشن مل جاتی تھی اور یہ بی پی ایم پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ کتنی رقم اپنے ڈاک خانے میں جمع کرواسکتا تھا۔

عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بی پی ایم میں پھرتی اور ذہنی چوکنا پن نظر آتا تھا۔ ہم تینوں اس کے گھر کی طرف پیدل ہی چلنے لگے۔ ڈاک خانے میں کام کر رہے ڈیلوری ایجنٹوں نے سائیکل اور بیگ لے کر ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا۔

راہ میں چلتے چلتے ایک آدمی ملا جو برانچ پوسٹ ماسٹر سے مخاطب ہوا۔ ''بابو جی، ڈاک خانے جارہے ہو کیا؟''

بابو جی نے اسے پہلو تہی کرنے کی بہت کوشش کی مگر ان پڑھ دہقان کچھ سمجھ نہیں پایا۔ اس لیے پوسٹ ماسٹر جواب دینے پر مجبور ہو گیا۔ ''ہاں بہاری وہیں جارہا ہوں۔''

''تو میرا کام کرلو بابو جی۔'' اس نے اپنی صدری میں سے ایک پاس بک نکالا اور پھر دوسری جیب سے سوسو کے دس نوٹ نکال کر پوسٹ ماسٹر کو یہ کہتے ہوئے تھما دیے۔ ''بابو جی میرے کھاتے میں یہ روپیہ ڈال دینا۔ اب کاہے کو میں اس گرمی میں تمھارے ساتھ اتنی دور چلا جاؤں۔ بعد میں چوپڑی لے لوں گا۔''

انسپکٹر میری توجہ ہٹانے کے لیے گاؤں کی تاریخ کے بارے میں اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ان کے درمیان ہو رہی باتوں پر کوئی دھیان نہ دوں۔ مگر میں نے جو نوٹ کرنا تھا وہ کرلیا البتہ اس کو الجھن سے بچانے کے لیے اس وقت کوئی سوال نہیں پوچھا۔

گاؤں میں ڈاک خانے عموماً بی پی ایم کے گھر ہی میں ہوتے ہیں۔ بالکل گھر جیسا ماحول تھا۔ پوسٹ ماسٹر کی بیوی نہیں تھی مگر تین شادی شدہ لڑکے اور دو بیٹیاں تھیں جو بیاہی جا چکی تھیں۔ گھر میں ننھے بچے ہلڑ مچا رہے تھے اور مائیں ان کو مختلف طریقوں سے چپ کرانے میں منہمک

تھیں۔ جس کمرے میں ڈاک خانے کا کام ہوتا تھا وہاں ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی جس پر ایک گدا بچھایا گیا تھا۔ اوپر ہاتھ سے کڑھائی کی ہوئی چادر بچھی ہوئی تھی اور اسی ڈائزین کے تکیے بھی رکھے ہوئے تھے۔ کمرے میں کھڑکی کے ساتھ ایک لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی کرسی اور میز تھی جس پر بیٹھ کر پوسٹ ماسٹر ڈاک خانے کا کام انجام دیتا تھا۔ بغل میں لکڑی کا ایک بکس تھا جس میں ڈاک خانے کی سٹیشنری جیسے پوسٹ کارڈ، اَنتر دیشی، لفافے، رجسٹرڈ لفافے، منی آرڈر، مہریں، کالا انک پیڈ، اکاونٹ کی کتابیں، رسیدیں اور دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے کے اندر ایک پرانا ڈاک کا تھیلا بطور ڈور میٹ بچھا ہوا تھا جو بعد میں چپکے سے انسپکٹر نے ای ڈی ڈی اے سے اٹھوا کر غائب کر دیا تا کہ میری نظر اس پر نہ پڑے۔

پوسٹ ماسٹر کی چھوٹی بہو جلدی سے ٹرے میں مٹکے کا ٹھنڈا پانی اور مٹھائی لے کر آئی اور سب کو پیش کرنے لگی۔ بہت ہی خوبصورت تھی۔ معلوم ہوا دو سال پہلے ہی شادی ہوئی تھی اور ابھی کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ سسر سامنے ہونے کے سبب گھونگھٹ کچھ زیادہ ہی نیچے کر کے چل رہی تھی۔ اس کے لمبے کالے بال نیم شفاف ساڑی کے اندر چندن کے پیڑ سے لپٹے ہوئے سانپ کی مانند لگ رہے تھے۔ ایڑیوں میں پائل لگی ہوئی تھی جس کی جھنکار نے فضا میں صوتی آہنگ پیدا کر دیا۔ وہ شرماتی لجاتی آئی اور مجھے پانی اور مٹھائی پیش کی۔ میں اس کی چوڑیوں سے بھری ہوئی گوری کلائی کو دیکھتا رہ گیا۔ شاید اس کو بھی میرے اس ردعمل کا احساس ہو گیا۔ اس لیے مجھے پانی اور مٹھائی تھمادی اور آنچل کے نیچے سے مسکرانے لگی۔ پھر جلدی سے گھوم کر واپس اندر چلی گئی۔ واپسی میں اس کی چال میں غزالوں کی سی پھرتی آ گئی۔

برانچ آفس کا انسپکشن کرنے میں ایک دو گھنٹے لگ گئے۔ انسپکٹر نے مجھے اس کی باریکیاں سمجھائیں۔ اس درمیان چائے وغیرہ بھی پی لی۔ چائے پیتے وقت بی پی ایم اندر چلے گئے اور میں نے موقع غنیمت سمجھ کر انسپکٹر سے پوچھا: ”جب ہم تھوڑی دیر پہلے یہاں آ رہے تھے تو ایک گاؤں

والے نے پوسٹ ماسٹر کو ایک ہزار روپے تھما دیے۔ نہ کوئی رسید اور نہ کوئی ٹھپا۔ یہ تو قواعد وضوابط کے خلاف ہے۔"

"ارے سر، کتابوں میں لکھے پر یہ دنیا تھوڑی ہی چلتی ہے۔ گاؤں میں پوسٹ ماسٹر کی حیثیت ایک امین کی ہوتی ہے۔ اس پر ہر کوئی اعتبار کرتا ہے۔ وہ تو کسی کی امانت کو خرد برد کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"مگر قواعد وضوابط کا کچھ تو خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"سر گاؤں کی پرمپرا ہی ایسی ہوتی ہے کہ لوگ قواعد وضوابط کی بہ نسبت اپنی روایتوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ان کے لیے تو پوسٹ ماسٹر امانت داری کا علامیہ ہوتا ہے۔ ہم کتنی بھی کوشش کریں کہ لوگ باضابطہ طور پر روپیوں کا لین دین کریں اور رسید لینے پر اصرار کریں مگر کوئی نہیں مانے گا۔ ابھی ہمارے گاؤں شہری بدعتوں سے بچے ہوئے ہیں البتہ جہاں پر بھی شہری زندگی کا اثر پڑتا ہے، وہ گاؤں گاؤں نہیں رہتا۔

اس کے بعد ہم دونوں وہاں سے چل دیے۔ پوسٹ آفس کا ڈیلوری سٹاف ہمارے لیے سائیکل لے کر ڈاک خانے کے باہر کھڑا تھا۔ تب تک گاؤں والوں کو پتا لگ چکا تھا کہ ڈاک خانے کے بڑے افسر ڈاک بابو کے گھر آ چکے ہیں۔ جس وقت ہم کوچ کرنے کے لیے باہر نکلے، وہاں گاؤں کے بیشتر لوگ ـ بچے، جوان، بوڑھے، مرد، عورتیں ـ ہمیں دیکھنے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔ ویسے ہی جیسے کسی نئی بیاہی چھوری کی رخصتی کے سمئے سارا گاؤں اُمڈ پڑتا ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر سب کو الوداع کہہ دیا۔ پھر ہم دونوں سائیکل پر سوار ہو گئے اور پیڈل مارتے ہوئے کچی سڑک پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے اور وہ گاؤں جس نے ایک ہی دن میں میرا من موہ لیا تھا پیچھے چھوٹ گیا۔

☆☆☆☆☆

لہو کے گرداب

کئی گھنٹوں سے وہ اپنے ہم سفر کا انتظار کر رہی تھی مگر وہ واپس آیا نہ کہیں دکھائی دیا۔ ہر لمحہ اس کے لیے امتحان بنتا جارہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ ''یہ ریل گاڑی جب منزل مقصود پر پہنچ جائے گی تو میں کہاں جاؤں گی؟ وہاں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ اجنبی شہر...... اجنبی راستے..... اجنبی لوگ....!''

اس کا اپنا ملک بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔

رنگ پور سے عذرا ایک دلال کے ساتھ چلی تھی جس نے اسے ممبئ میں کام دلانے کا جھانسہ دیا تھا۔ اس نے عذرا کو بنگالی زبان میں سمجھایا تھا۔ ''عذرا، میری بات سنو۔ تمھاری دو سہیلیاں، رئیسہ اور کومل، ممبئ میں مزے سے جی رہی ہیں۔ میں نے انھیں کام دلوایا ہے۔ مہینے کے پندرہ بیس ہزار کماتی ہیں۔ سب کچھ ہے ان کے پاس۔ کھانا پینا، کپڑے لتے، رہنے کی جگہ اور پھر ہر ماہ اپنے گھر روپے بھیج دیتی ہیں۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ ان کے گھروں کی حالت کتنی بدل چکی ہے۔''

دلال رہنے والا تو مغربی بنگال کا تھا مگر ممبئ میں کئی برسوں سے اقامت پذیر تھا۔ وہ بہت بڑے کبوتر باز کے لیے کام کرتا تھا۔ کام تھا بنگلا دیش سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو پھانس کر سرحد پار کرا لینا اور پھر انھیں ممبئ تک پہنچا کر مالک کے حوالے کر دینا۔ ایک پھیرے میں ایک دو کبوتر ٹھکانے تک پہنچ جاتے تھے اور وہ ایک ڈیڑھ لاکھ روپے کما لیتا تھا۔ یہ سب مال اکیلے اس کی جیب میں نہیں جاتا تھا کیونکہ ہر موڑ پر کبوتروں کو چیلوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ بارڈر سیکورٹی، ریلوے پولیس، ممبئ پولیس، سی آئی ڈی، ریلوے چیکنگ ساف....! مالک ان لوگوں کو گھریلو کام کاج کے

لیے ضرورت مندوں کے پاس بھیج دیتا اور ہر مہینے ان کی تنخواہ کا بیس فیصد حصہ اس کے سامنے خود بخود پہنچ جاتا۔"

ممبئی میں ایسی ہزاروں لڑکیاں ہیں جو ناجائز طور پر گندی بستیوں میں رہتی ہیں اور متوسط گھرانوں میں کام کاج کرتی ہیں۔ جھاڑو پونچھا، کپڑے برتن اور کہیں کہیں رسوئی کا کام بھی کرتی ہیں۔ اگر یہ لوگ نہ ہوں تو ممبئی کے متوسط طبقے کی زندگی اجیرن ہوجائے گی۔ میاں بیوی دونوں صبح سویرے نکل جاتے ہیں اور رات کو تھکے ماندے لوٹ آتے ہیں۔ پھر کون برتن مانجھتا پھرے اور کون کپڑے دھوتا پھرے۔ روٹی پکانا اور کھانا بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ اکثر ناشتے میں دو منٹ میگی سے پیٹ بھر لیتے ہیں اور رات گئے باہر سے وڑا پاؤ خرید کر گزارا کر لیتے ہیں۔

عذرا نے دلال کی بات سن کر بنگالی میں بے ساختہ جواب دیا۔ "ہاں، میں بھی سوچوں کہ ان کے گھر والوں کے پاس اتنا سارا مال کہاں سے آگیا۔" پھر وہ رک گئی اور کچھ وقفے کے بعد بولی۔ "میں تمھاری بات پر وِچار کرلوں گی۔ پرسوں جواب دوں گی۔"

اس کے بعد وہ سوچ وفکر کے سمندر میں ڈوب گئی۔ "اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ والدین سے بچے پالے نہیں جاتے۔ تین لڑکے تھے، ایک ایک کر کے گھر سے بھاگ گئے۔ مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ ہم زندہ ہیں یا مر گئیں۔ پانچ لڑکیاں تھیں، دو جو مجھ سے بڑی تھیں نہ جانے کن لڑکوں کے ساتھ بھاگ گئیں۔ پھر ان کا اتا پتا بھی معلوم نہ ہوسکا۔ چھوٹی دو اور ہیں۔ ابھی کمسن ہیں۔ ابو اب کمانے کے لائق نہیں رہے۔ بے چاری ماں ہی کما کر لاتی ہے اور ہم سب کا پیٹ بھرتی ہے۔ کیا کام کرتی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

یہ اس کے دل کی آواز تھی جو اس کو دلال کی طرف کھینچتی چلی گئی اور وہ چوتھے ہی روز اس کے ساتھ سرحد پار کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ سرحد پار کرنے میں کوئی زیادہ جوکھم نہیں اٹھانا پڑا۔ چار ہزار کلومیٹر لمبی چھلنی جیسی سرحد جو ہندستان کی کئی ریاستوں۔ تریپورا، آسام اور میگھالیہ۔ سے سٹی

ہوئی ہے اور جس کے درمیان دوسو کے قریب 'چیت محل' ہیں جن کا فیصلہ برسوں سے نہیں ہو رہا ہے۔
دونوں آسام کے راستے ہندستان پہنچے اور پھر ریل گاڑی میں سوار ہو کر ممبئی کی جانب روانہ ہوئے۔
سفر کے دوران دلال نے اسے عام استعمال کے بہت سارے ہندی الفاظ سکھائے اور ہدایت دی
کہ اگر کوئی نام پوچھے تو کومل کہہ دینا اور اگر گھر کے بارے میں پوچھے تو مالدہ بنگال کہہ دینا۔ اس
نے عذرا کو بھروسہ دلایا کہ دو تین مہینے تک وہ ہندی اور مراٹھی سیکھ جائے گی۔ عذرا کو اطمینان ہو گیا
کہ اب مستقبل کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دن کا سفر باتوں باتوں میں گزر گیا۔ شام ڈھلتے
ہی دلال کھانا لانے کے لیے ریل گاڑی سے نیچے اترا۔ وہ ابھی دکاندار سے بحث کر ہی رہا تھا کہ
پولیس نے شک کی بنا پر اسے دھر دبوچ لیا اور پوچھ تاچھ کرنے لگی۔ اس نے پولیس کی مٹھی گرم کر کے
اپنی جان چھڑا تو لی مگر تب تک ٹرین چھوٹ گئی اور وہ سانس روک کر رینگتی ہوئی ریل گاڑی کو دیکھتا
رہ گیا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ پل بھر میں اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

رات بھر عذرا کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس کا نگہبان کہاں چلا گیا۔ سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی
پہلی بار گھر سے باہر نکلی تھی اور پرائے دیش میں انجان منزل کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اندر ہی
اندر وہ گھلنے لگی۔ بہت پشیمان تھی کہ دلال کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر کیوں خود کو مصیبت میں ڈال
دیا۔ وسوسوں اور اندیشوں نے اس کو گھیر لیا۔ پھر خود ہی حجت کرتی۔ ''پر آتی کیوں نہیں۔ میرے
پاس کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ گھر میں والدین پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ بڑی دو بہنوں کی کوئی خبر نہیں کہ
کہاں ہیں۔ جن کے ساتھ چلی گئیں، کیا معلوم وہ کون تھے۔ ہوسکتا ہے مزدوری کر کے کہیں پیٹ
پال رہے ہوں یا پھر انھوں نے میری بہنوں کو بیچ کھایا ہو۔ اب لگ رہا ہے میرے ساتھ بھی ویسا ہی
کچھ ہونے والا ہے۔ بندو نے شادی کی بات کی نہ جسم بیچنے کی۔ کہتا تھا جھاڑو پونچھا کا کام دلوا دوں
گا۔ مہینے کی پندرہ ہزار کمائی ہو گی مگر ہر مہینے کی تنخواہ میں سے بیس فیصد کمیشن دینا پڑے گا۔ سمجھ نہیں
آرہا ہے کہ وہ کہاں گیا۔ شکل سے بھلا مانس لگ رہا تھا۔ اس پر کچھ بپتا ضرور آئی ہو گی یا پھر ہوسکتا

ہے وہ بھی مجھے بیچنے کے چکر میں نکلا ہو؟"

پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگی۔ "اگر ایسا ہوتا تو میرے ساتھ اتنی ہمدردی سے پیش نہ آتا۔ مجھے اس طرح دنیا کی اونچ نیچ نہ سمجھاتا۔ بیچنے کے لیے لایا ہوتا تو راستے میں غائب کیوں ہو جاتا، بیچ کر ہی دم لیتا۔" دو دن اور دو راتیں اس نے بھوکی پیاسی کاٹ لیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے جنھیں وہ چپکے سے پونچھ لیتی تا کہ کسی کو اس کی مصیبت کی خبر نہ ہو۔

ممبئی میں ٹرین رک گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ سارے مسافر ایک کے بعد ایک اترتے چلے جا رہے ہیں اور ریل گاڑی خالی ہوتی جا رہی ہے۔ بوجھل قدموں سے وہ بھی ٹرین سے اتری اور اپنے چاروں اور دیکھنے لگی۔ کہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر سامنے ایک بنچ کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ بہت دیر تک وہ اس کا انتظار کرتی رہی۔ مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کو زمین کھا گئی یا آسمان، عذرا کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ سورج ڈھلتے ہی ایک پولیس والا گشت کرتا ہوا ادھر آ نکلا ۔اس کو گٹھڑی سی بنی ہوئی اس لڑکی پر شک ہوا۔ وہ دو چار بار عذرا کے پاس سے گزر گیا اور اسے گھورتا رہا۔ عذرا پریشان ہو گئی اور چپکے سے وہاں سے کھسک کر ریلوے سٹیشن سے بھاگنے میں کامیاب ہوئی۔ پھر بھی پولیس کی نظروں سے کہاں بچ پاتی۔

اندر پلیٹ فارم پر ایک محدود سی دنیا تھی۔ اب وہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہو چکی تھی جس کی کوئی سیمانہ تھی۔ یہاں بھی ہر طرف وہی خاکی وردی والے نظر آ رہے تھے جن کا نام لیتے ہی بدن میں جھرجھریاں دوڑنے لگتی ہیں۔ ہوس اور حرص کے سوداگر۔ ان کی کارکردگی سے گھن آتی ہے۔ سٹیشن سے باہر نکل کر عذرا چلتی رہی۔ ہاتھ میں ایک جھولی تھی جس میں روزمرہ کے چند کپڑے تھے۔ اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ سڑک پر کچھ دور جا کر وہ ایک حوالدار سے ٹکرائی۔ وہ نام تھا گوپال شندے۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتی رہی شندے سایہ بن کر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ حوالدار کی نظروں سے بچنا بہت مشکل تھا۔ اس نے بہت دور تک اس کا پیچھا کر لیا مگر

ہوئی ہے اور جس کے درمیان دوسو کے قریب 'چیت محل' ہیں جن کا فیصلہ برسوں سے نہیں ہو رہا ہے۔

دونوں آسام کے راستے ہندستان پہنچے اور پھر ریل گاڑی میں سوار ہو کر ممبئی کی جانب روانہ ہوئے۔ سفر کے دوران دلال نے اسے عام استعمال کے بہت سارے ہندی الفاظ سکھائے اور ہدایت دی کہ اگر کوئی نام پوچھے تو کومل کہہ دینا اور اگر گھر کے بارے میں پوچھے تو مالدہ بنگال کہہ دینا۔ اس نے عذرا کو بھروسہ دلایا کہ دو تین مہینے تک وہ ہندی اور مراٹھی سیکھ جائے گی۔ عذرا کو اطمینان ہو گیا کہ اب مستقبل کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دن کا سفر باتوں باتوں میں گزر گیا۔ شام ڈھلتے ہی دلال کھانا لانے کے لیے ریل گاڑی سے نیچے اترا۔ وہ ابھی دکاندار سے بحث کر رہی رہا تھا کہ پولیس نے شک کی بنا پر اسے دھر دبوچ لیا اور پوچھ تاچھ کرنے لگی۔ اس نے پولیس کی مٹھی گرم کر کے اپنی جان چھڑا تو لی مگر تب تک ٹرین چھوٹ گئی اور وہ سانس روک کر رینگتی ہوئی ریل گاڑی کو دیکھتا رہ گیا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ پل بھر میں اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

رات بھر عذرا کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس کا نگہبان کہاں چلا گیا۔ سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی پہلی بار گھر سے باہر نکلی تھی اور پرائے دیش میں انجان منزل کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اندر ہی اندر وہ گھلنے لگی۔ بہت پشیمان تھی کہ دلال کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر کیوں خود کو مصیبت میں ڈال دیا۔ وسوسوں اور اندیشوں نے اس کو گھیر لیا۔ پھر خود ہی حجت کرتی۔ "پر آتی کیوں نہیں۔ میرے پاس کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ گھر میں والدین پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ بڑی دو بہنوں کی کوئی خبر نہیں کہ کہاں ہیں۔ جن کے ساتھ چلی گئیں، کیا معلوم وہ کون تھے۔ ہو سکتا ہے مزدوری کر کے کہیں پیٹ پال رہے ہوں یا پھر انھوں نے میری بہنوں کو بیچ کھایا ہو۔ اب لگ رہا ہے میرے ساتھ بھی ویسا ہی کچھ ہونے والا ہے۔ بندو نے شادی کی بات کی نہ جسم بیچنے کی۔ کہتا تھا جھاڑو پونچھا کا کام دلوا دوں گا۔ مہینے کی پندرہ ہزار کمائی ہو گی مگر ہر مہینے کی تنخواہ میں سے بیس فیصد کمیشن دینا پڑے گا۔ سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ وہ کہاں گیا۔ شکل سے بھلا مانس لگ رہا تھا۔ اس پر کچھ بپتا ضرور آئی ہو گی یا پھر ہو سکتا

ہے وہ بھی مجھے بیچنے کے چکر میں نکلا ہو؟"

پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگی۔ "اگر ایسا ہوتا تو میرے ساتھ اتنی ہمدردی سے پیش نہ آتا۔ مجھے اس طرح دنیا کی اونچ نیچ نہ سمجھاتا۔ بیچنے کے لیے لایا ہوتا تو راستے میں غائب کیوں ہو جاتا، بیچ کر ہی دم لیتا۔" دو دن اور دو راتیں اس نے بھوکی پیاسی کاٹ لیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے جنھیں وہ چپکے سے پونچھ لیتی تا کہ کسی کو اس کی مصیبت کی خبر نہ ہو۔

ممبئی میں ٹرین رک گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ سارے مسافر ایک کے بعد ایک اترتے چلے جا رہے ہیں اور ریل گاڑی خالی ہوتی جا رہی ہے۔ بوجھل قدموں سے وہ بھی ٹرین سے اتری اور اپنے چاروں اور دیکھنے لگی۔ کہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر سامنے ایک بنچ کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ بہت دیر تک وہ اس کا انتظار کرتی رہی۔ مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کو زمین کھا گئی یا آسمان، عذرا کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ سورج ڈھلتے ہی ایک پولیس والا گشت کرتا ہوا ادھر آنکلا ۔ اس کو گٹھڑی سی بنی ہوئی اس لڑکی پر شک ہوا۔ وہ دو چار بار عذرا کے پاس سے گزر گیا اور اسے گھورتا رہا۔ عذرا پریشان ہوگئی اور چپکے سے وہاں سے کھسک کر ریلوے سٹیشن سے بھاگنے میں کامیاب ہوئی۔ پھر بھی پولیس کی نظروں سے کہاں بچ پاتی۔

اندر پلیٹ فارم پر ایک محدود سی دنیا تھی۔ اب وہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہو چکی تھی جس کی کوئی سیما نہ تھی۔ یہاں بھی ہر طرف وہی خاکی وردی والے نظر آ رہے تھے جن کا نام لیتے ہی بدن میں جھرجھریاں دوڑنے لگتی ہیں۔ ہوس اور حرص کے سوداگر۔ ان کی کارکردگی سے گھن آتی ہے۔ سٹیشن سے باہر نکل کر عذرا چلتی رہی۔ ہاتھ میں ایک جھولی تھی جس میں روزمرہ کے چند کپڑے تھے۔ اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ سڑک پر کچھ دور جا کر وہ ایک حوالدار سے ٹکرائی۔ نام تھا گوپال شندے۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتی رہی شندے سایہ بن کر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ خوفزدہ ہوگئی۔ حوالدار کی نظروں سے بچنا بہت مشکل تھا۔ اس نے بہت دور تک اس کا پیچھا کر لیا مگر

وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی وہاں سے آگے ہی آگے چلتی رہی۔ نہ کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ ہی کوئی منزل۔ بہت دور جا کر اس کی نظریں کچھ لوگوں پر پڑیں جو فٹ پاتھ پر سو رہے تھے۔ سو اس نے بھی رات وہیں پر گزارنے کی ٹھان لی۔ جھولی نیچے رکھ لی اور اس پر سر رکھ کر لیٹنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ پاؤں پسارنے ہی لگی تھی کہ دور سے ایک کرخت آواز نے اس کو جھنجھوڑ دیا۔ ''اے لڑکی، وہاں کیا کر رہی ہو۔ یہ تمھارے سونے کی جگہ نہیں ہے۔ کیا نام ہے تمھارا؟''

عذرا اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔ اسے دلال کی بات یاد آ گئی کہ بنگلا دیشی ہونے کی وجہ سے پولیس والوں سے بچ کر رہنا۔ کبھی اپنا اصلی نام یا پتا نہیں بتانا۔ کوئی نام پوچھے تو ہندو نام بتا دینا جیسے کومل یا رتنا اور جگہ پوچھے تو مالدہ کہہ دینا۔ وہ اپنی ہمت بٹورنے لگی۔

دریں اثنا حوالدار اس کے پاس آ پہنچا اور سیدھے جا کر اس کی بانہہ پکڑ لی۔ پھر رعب دار آواز میں پوچھنے لگا۔ ''کیوں بے لڑکی۔ کون ہو تم؟ کہاں سے آئی ہو؟''

لڑکی رونے لگی۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔ حلق سے کوئی لفظ بھی نکل نہیں رہا تھا۔

پولیس والے نے پھر استفسار کیا۔ ''نام بتاؤ گی یا پولیس تھانے لے چلوں۔''

وہ زار و قطار رونے لگی۔ بنگالی میں کہنے لگی۔ ''کچھ سمجھ نہیں آتا۔''

حوالدار نے سوچا کہ زیادہ کچھ کہوں تو وہ چیخنے چلانے لگے گی اور فٹ پاتھ کے لوگ جاگ جائیں گے اور میری بنی بنائی سکیم فیل ہو جائے گی۔ اس لیے اس کی بانہہ چھوڑ کر اس نے نرم لہجے میں پوچھ لیا۔ ''دیکھو میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے سوالوں کا جواب دو تا کہ میں تم کو تمھارے گھر والوں سے ملوا دوں۔''

نہ اس کو گوپال شندے کی زبان سمجھ آ رہی تھی اور نہ ہی وہ کچھ بول پا رہی تھی۔ وہ صرف بنگالی جانتی تھی اور کچھ بھی نہیں۔ اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نکل نہیں پا رہی تھی۔ تاہم کچھ الفاظ کے معنی وہ ہندی اور بنگالی کی مماثلت کے سبب یا پھر حوالدار کے اشاروں سے سمجھنے لگی۔ حوالدار اس

کوایک جھاڑی کے پیچھے لے کر گیا اور اس کی بانہہ مروڑ کر پوچھنے لگا۔ ''کیا نام ہے تمھارا؟''

''عذرا'' وہ بولی۔ ہڑ بڑاہٹ میں اسے دلال کا دیا ہوا نام یاد ہی نہیں آیا۔

''گھر کہاں ہے تمھارا؟''

وہ دلال کی بتائی ہوئی جگہ کا نام بھی بھول گئی، بولی۔ ''رنگ پور، بنگلا دیش۔''

''تو تم بنگلا دیشی ہو؟''

''ہاں''

''پھر تو تمھیں جیل لے جانا پڑے گا۔ چلو میرے ساتھ۔''

وہ رونے اور بلبلانے لگی لیکن گوپال اس کی بانہہ کو مضبوطی سے تھامے اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ عذرا دوسرے ہاتھ سے اپنی پوٹلی کو سینے کے ساتھ دبائے ہوئے کسی مزاحمت کے بغیر اس کے ساتھ چلتی رہی۔ اس کے لیے وہ پوٹلی ہی سب کچھ تھی گو اس میں صرف دو چار کپڑے تھے۔ راستے میں سب کچھ چھوٹ چکا تھا صرف اس پوٹلی کے بغیر۔

''چلو چھوڑو تم کو میں پولیس سٹیشن نہیں لے جاؤں گا۔ اپنے گھر میں رکھوں گا۔ میں اکیلا ہوں۔ تم میرے گھر کا کام کرتی رہنا۔ اس طرح تمھارے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور تم جیل جانے سے بچ جاؤ گی۔'' شندے ایسے بول رہا تھا جیسے عذرا سب کچھ سمجھ رہی ہو۔ ردِ عمل میں وہ کچھ نہ بولی۔ بولتی کیا؟ اسے ہندی سمجھ آتی تھی نہ بولنی آتی تھی۔ بس کبھی کبھی اشارے سمجھ لیتی تھی۔ گوپال شندے اس کو سیدھے اپنے گھر لے گیا۔ گھر کیا تھا بھیڑ بھاڑ والی ایک بستی میں دوسری منزل پر ایک چھوٹی سے چال تھی جس میں دو کمرے تھے۔ جگہ جگہ دیواروں کا پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ جدھر نظر ڈالو وہاں سامان بکھرا پڑا تھا۔ کہیں پر وردی، کہیں قمیص، کہیں پتلون، کہیں بنیان، کہیں کچھے، کہیں موزے اور کہیں جوتے۔ کچن میں چار پانچ ایلومنیم کے برتن اور گیس کا چولہا تھا۔ کچن شیلف کے نیچے شراب کی بے شمار خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ عذرا یہ دیکھ کر

سہم گئی۔ اسے اپنے مستقبل کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ البتہ اتنی تسلی تھی کہ جان بچ گئی۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں جا کر دبک گئی۔

شندے کو گھڑی پر نظر پڑی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ جلدی سے کھانا لانے کے لیے بازار چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے صدر دروازے پر تالا لگا دیا۔ کئی بار عذرا کے جی میں آئی کہ کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگ جائے۔ پھر سوچا دوسری منزل ہے، ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی اور جیل الگ سے جانا پڑے گا۔ اس لیے خاموش وہیں بیٹھی رہی۔ کچھ دیر میں گوپال شندے اندر داخل ہوا۔ ایک اخبار کھول کر زمین پر بچھا دیا اور اسی پر روٹی، چاول اور سبزی کے پتّل رکھ دیے۔ پھر جیب سے پوّا نکال کر گلاس میں انڈیل دیا اور اسے پینے لگا۔ جب نشہ چڑھ گیا تو لگاتار ہنستا رہا اور بولتا بھی رہا۔

''میری بیوی پانچ سال پہلے مر گئی۔ نہ جانے کیا ہو گیا اسے۔ گربھوتی تھی۔ بچہ جننے کے لیے ہسپتال میں بھرتی کروا دیا۔ وہاں سے ماں بیٹے کی لاشیں واپس مل گئیں۔ بھگوان بھی کتنا ظالم ہے۔ تیس سال کی عمر میں رنڈوا بنا دیا۔'' اس نے زوردار قہقہہ مارا۔

عذرا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے نشے میں ہونے اور زور زور سے باتیں کرنے سے گھبرا رہی تھی مگر کچھ بھی نہ بولی۔ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ آخر کار بھات سبزی زہر مار کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ گوپال شندے کو سمجھ آیا کہ وہ سونے کے لیے جگہ تلاش رہی ہے۔ جلدی سے اٹھا اور اس کے لیے فرش پر ایک دری بچھائی اور ساتھ ہی اوڑھنے کے لیے ایک چادر دے دی۔ خود دوسرے کمرے میں منجھی پر لیٹ گیا۔ عذرا بے چاری آدھی رات تک کروٹیں بدلتی رہی اور پھر اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو اس نے خود کو منجھی پر سویا ہوا پایا۔ گوپال اس کے لیے ناشتہ رکھ کر دفتر چلا گیا تھا۔ باہر دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

دن بھر وہ روتی رہی، تڑپتی رہی، چلاتی رہی مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ کوئی سن بھی لیتا تو کیا کر سکتا تھا۔ بھلا پولیس حوالدار سے کون دشمنی مول لیتا۔ سب پڑوسی اپنے اپنے کاموں میں منہمک تھے۔ عذرا بھانپ گئی کہ یہاں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی ہے۔ اس لیے اس نے قسمت کے لکھے کو ہی تسلیم کر لیا۔ وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے لگی۔ گوپال شندے صبح سویرے چلا جاتا اور دیر رات لوٹ آتا۔ عذرا نے چند ہی روز میں گھر کی ہیئت بدل ڈالی۔ سب کچھ صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ کچن، بیڈ روم، اور بیٹھک۔ اب اندر کمرے میں دوسری منجھی ڈالی گئی جس پر وہ سوتی تھی۔ اس کے حسن اہتمام سے گوپال اتنا خوش ہوا کہ اس نے چال میں تالا لگانا ترک کر دیا۔

گوپال شندے کو اب وہ جان سے بھی عزیز لگنے لگی۔ اس کو عذرا میں ایسی اپنائیت نظر آنے لگی جس کا وہ کئی برسوں سے متلاشی تھا۔ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے عذرا کے کہیں آنے جانے پر سے پابندیاں ہٹا لیں۔ گوپال نے اسے آہستہ آہستہ ہندی اور مراٹھی بھی سکھائی۔ اب عذرا پڑوسیوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی اور ان کے دکھ سکھ میں برابر کی شریک ہو جاتی۔ پڑوسیوں کو معلوم تھا کہ بیوی کی رحلت کے سبب شندے نے اپنے گھر میں اس عورت کو ڈال رکھا ہے۔ پانچ چھ مہینوں کے بعد وہ دو تین گھروں میں کام کرنے کے لیے بھی جانے لگی۔ چنانچہ سب اس کو گوپال شندے کی رکھیل مانتے تھے، اس نے اپنا نام بدل کر کومل رکھ دیا۔ شندے بھی اسے کومل ہی کہتا تھا۔ وہ بنگالی تو لگتی تھی مگر کسی کو یہ شک نہ ہونے دیا کہ وہ بنگلہ دیشی مسلمان ہے۔

گوپال شندے سوچنے لگا کہ ابھی تو آگے طویل عمر پڑی ہے۔ تنہا زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔ کوئی نہ کوئی سہارا تو چاہیے۔ کیوں نہ اسی لڑکی سے شادی رچا لوں۔ آخر کیا کمی ہے اس میں۔ دوسری شادی کے بارے میں وہ کئی برسوں سے سوچ رہا تھا۔ مگر لڑکی ڈھونڈنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اب تو بھگوان نے چھپر پھاڑ کر لڑکی دی تھی۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو اب اچھی طرح جانتے بھی تھے، سمجھتے بھی تھے۔ کسی کو کیا عذر ہو سکتا تھا؟

سہم گئی۔ اسے اپنے مستقبل کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ البتہ اتنی تسلی تھی کہ جان بچ گئی۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں جا کر دبک گئی۔

شندے کو گھڑی پر نظر پڑی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ جلدی سے کھانا لانے کے لیے بازار چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے صدر دروازے پر تالا لگا دیا۔ کئی بار عذرا کے جی میں آئی کہ کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگ جائے۔ پھر سوچا دوسری منزل ہے، ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی اور جیل الگ سے جانا پڑے گا۔ اس لیے خاموش وہیں بیٹھی رہی۔ کچھ دیر میں گوپال شندے اندر داخل ہوا۔ ایک اخبار کھول کر زمین پر بچھا دیا اور اسی پر روٹی، چاول اور سبزی کے پتّل رکھ دیے۔ پھر جیب سے پوّا نکال کر گلاس میں انڈیل دیا اور اسے پینے لگا۔ جب نشہ چڑھ گیا تو لگاتار ہنستا رہا اور بولتا بھی رہا۔

''میری بیوی پانچ سال پہلے مر گئی۔ نہ جانے کیا ہو گیا اسے۔ گربھوتی تھی۔ بچہ جننے کے لیے ہسپتال میں بھرتی کروا دیا۔ وہاں سے ماں بیٹے کی لاشیں واپس مل گئیں۔ بھگوان بھی کتنا ظالم ہے۔ تیس سال کی عمر میں رنڈوا بنا دیا۔'' اس نے زوردار قہقہہ مارا۔

عذرا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے نشے میں ہونے اور زور زور سے باتیں کرنے سے گھبرا رہی تھی مگر کچھ بھی نہ بولی۔ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ آخر کار بھات سبزی زہر مار کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ گوپال شندے کو سمجھ آیا کہ وہ سونے کے لیے جگہ تلاش رہی ہے۔ جلدی سے اٹھا اور اس کے لیے فرش پر ایک دری بچھائی اور ساتھ ہی اوڑھنے کے لیے ایک چادر دے دی۔ خود دوسرے کمرے میں منجھی پر لیٹ گیا۔ عذرا بے چاری آدھی رات تک کروٹیں بدلتی رہی اور پھر اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو اس نے خود کو منجھی پر سویا ہوا پایا۔ گوپال اس کے لیے ناشتہ رکھ کر دفتر چلا گیا تھا۔ باہر دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

دن بھر وہ روتی رہی، تڑپتی رہی، چلاتی رہی مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ کوئی سن بھی لیتا تو کیا کر سکتا تھا۔ بھلا پولیس حوالدار سے کون دشمنی مول لیتا۔ سب پڑوسی اپنے اپنے کاموں میں منہمک تھے۔ عذرا بھانپ گئی کہ یہاں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی ہے۔ اس لیے اس نے قسمت کے لکھے کو ہی تسلیم کر لیا۔ وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے لگی۔ گوپال شندے صبح سویرے چلا جاتا اور دیر رات لوٹ آتا۔ عذرا نے چند ہی روز میں گھر کی ہیئت بدل ڈالی۔ سب کچھ صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ کچن، بیڈ روم، اور بیٹھک۔ اب اندر کمرے میں دوسری منجھی ڈالی گئی جس پر وہ سوتی تھی۔ اس کے حسن اہتمام سے گوپال اتنا خوش ہوا کہ اس نے چال میں تالا لگانا ترک کر دیا۔

گوپال شندے کو اب وہ جان سے بھی عزیز لگنے لگی۔ اس کو عذرا میں ایسی اپنائیت نظر آنے لگی جس کا وہ کئی برسوں سے متلاشی تھا۔ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے عذرا کے کہیں آنے جانے پر سے پابندیاں ہٹا لیں۔ گوپال نے اسے آہستہ آہستہ ہندی اور مراٹھی بھی سکھائی۔ اب عذرا پڑوسیوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی اور ان کے دکھ سکھ میں برابر کی شریک ہو جاتی۔ پڑوسیوں کو معلوم تھا کہ بیوی کی رحلت کے سبب شندے نے اپنے گھر میں اس عورت کو ڈال رکھا ہے۔ پانچ چھ مہینوں کے بعد وہ دو تین گھروں میں کام کرنے کے لیے بھی جانے لگی۔ چنانچہ سب اس کو گوپال شندے کی رکھیل مانتے تھے، اس نے اپنا نام بدل کر کومل رکھ دیا۔ شندے بھی اسے کومل ہی کہتا تھا۔ وہ بنگالی تو لگتی تھی مگر کسی کو یہ شک نہ ہونے دیا کہ وہ بنگلہ دیشی مسلمان ہے۔

گوپال شندے سوچنے لگا کہ ابھی تو آگے طویل عمر پڑی ہے۔ تنہا زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔ کوئی نہ کوئی سہارا تو چاہیے۔ کیوں نہ اسی لڑکی سے شادی رچا لوں۔ آخر کیا کمی ہے اس میں۔ دوسری شادی کے بارے میں وہ کئی برسوں سے سوچ رہا تھا۔ مگر لڑکی ڈھونڈنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اب تو بھگوان نے چھپر پھاڑ کر لڑکی دی تھی۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو اب اچھی طرح جانتے بھی تھے، سمجھتے بھی تھے۔ کسی کو کیا عذر ہو سکتا تھا؟

بات تو صحیح تھی۔ لڑکی بھی بالغ تھی۔ اپنا برا بھلا سمجھ سکتی تھی۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ آخر کار ایک روز اس نے عذرا سے بات کر ہی لی۔ ''کومل، اب تو ہم ایک قالب دو جان ہو چکے ہیں۔ ہمارے درمیان کوئی اجنبیت نہیں رہی۔ تم اور میں ایک دوسرے کو اتنے قریب سے جانتے ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم دونوں شادی کر لیں۔''

شادی کا نام سنتے ہی عذرا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کے درد کی ٹیسیں دوبارہ ابھر آئیں۔ اسے وہ کالی منحوس رات یاد آئی جب حوالدار گوپال شندے نے اس کو قید کر لیا تھا اور اس کی زندگی تباہ کر لی تھی۔ ظاہری طور پر وہ خوش و خرم دکھائی دیتی تھی مگر یہ چنگاری اس کے وجود میں تب سے سلگتی رہی تھی۔ وہ من ہی من میں سوچنے لگی۔ ''تم نے شادی کے لیے چھوڑا ہی کیا جو تم مجھ سے شادی کر لو گے۔ بدن نوچ لیا، روح نوچ لی، سانسیں نوچ لیں اور میرے خواب نوچ لیے۔ تم نے میری روح کا بلاتکار اسی روز کر لیا تھا جب مجھے پکڑ کر گھر لے آئے تھے اور اس چار دیواری میں مقفل کر دیا تھا۔''

''حوالدار صاحب، میں تو بنگلہ دیشی ہوں۔ آپ میرے ساتھ شادی کیسے کر سکتے ہیں؟ کسی کو اصلیت معلوم ہو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' اس نے جس لہجے میں جواب دیا اس میں طنز بھی تھا اور شرارت بھی۔

تلخی کے باوجود عذرا نے خود پر قابو پا لیا کیونکہ آج گوپال شندے کا جنم دن تھا اور اس نے گھر میں اپنی ہونے والی بیوی کے ساتھ جنم دن منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ عذرا نے بھی کوئی کمی نہیں کی تھی۔ کھانے کی اچھی اچھی چیزیں بنائی تھیں۔ دارو کے ساتھ کھانے کے لیے مچھلی کے پکوڑے اور تکے بنائے تھے جو اس نے شندے کے سامنے رکھ دیے۔ اس کے علاوہ بنگالی ہونے کے ناتے میٹھے میٹھے رس گلے بنائے تھے۔ شندے نے بوتل کھولی اور دارو پینے میں مست ہو گیا۔ عذرا نے کوکا کولا کی بوتل کھول کر اس کا ساتھ دیا۔

"چیئرس، سالگرہ مبارک ہو......میرے محسن۔"

"چیئرس، کومل......میری جان....چیئرس!"

جب پوری بوتل ختم ہوگئی تو عذرا نے اٹھ کر الماری سے ایک اور بوتل نکال کر سامنے رکھ دی۔

"یہ تمھاری سالگرہ پر میری طرف سے تحفہ، میرے آقا۔ یوں تو میں ہمیشہ تمھیں روکتی ہوں مگر آج تمھاری سالگرہ ہے اس لیے اجازت دیتی ہوں۔ تمھارا ایک رفیق کار ایک روز دے کر گیا تھا اور میں نے ایسے ہی موقعے کے لیے اٹھا رکھی تھی۔"

عذرا نے خود ہی بوتل کا ڈھکن کھول کر گوپال کے گلاس میں شراب انڈیل دی اور اس کو گاہے بہ گاہے اپنے ہاتھوں سے مونگ پھلی، مچھلی کے پکوڑے اور تکے کھلاتی رہی۔ آج عذرا کچھ زیادہ ہی مہربان لگ رہی تھی۔ بغل میں بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی تمازت نظر آرہی تھی۔ گوپال شندے اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دوسری بوتل بھی ختم کر دی۔ پھر اس کی گویائی میں لکنت سی آگئی۔ اب ہاتھ سے گلاس تھامنا مشکل ہورہا تھا۔ اتنا سارا کھانا جو سامنے سجا ہوا تھا اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ گوپال ایک نوالہ بھی نہ کھا سکا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھا بھی نہ جا رہا تھا۔ عذرا نے اٹھ کر اس کو سہارا دیا اور منجھی تک لے جا کر اس پر لٹا دیا۔ چند لمحوں ہی میں وہ خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔

اِدھر عذرا جھوٹے برتن، پتّل اور دیگر چیزیں سمیٹنے میں مشغول ہوگئی، اُدھر شندے خراٹے مارتا ہوا بے سدھ پڑا رہا۔ عذرا نے اس کی بانہہ ہلائی مگر وہ ایسا سویا پڑا تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر ہی نہ تھی۔ بستر پر اس کو شندے نہیں بلکہ وہ حوالدار نظر آرہا تھا جس نے ایک روز ڈرا دھمکا کر اس کو قید کر لیا تھا، اس کی معصومیت کا مذاق اڑایا تھا، اس کی عزت لوٹی تھی اور اس کے کنوارے خون سے اپنی سفید چادر پر لال دھبے ڈال دیے تھے۔ وہ روتی رہی تھی، سسکتی رہی تھی مگر نہ کسی نے اس کے رونے

کی آواز سنی اور نہ ہی اس کی سسکیاں۔

اب اس کی باری تھی۔ حوالدار بے سدھ سو رہا تھا۔ اور عذرا کے بدن میں مہا کالی کا روپ سما گیا۔ وہ جلدی جلدی کچن میں چلی گئی جہاں اس نے بازار سے کلہاڑی خرید کر چھپا رکھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کلہاڑی پکڑ لی، دوڑ کر واپس منجھی کے پاس آ گئی، پھر اپنی باہیں اوپر اٹھالیں اور 'یا علی' کہہ کر زور سے حوالدار کی گردن پر دے ماری۔

حوالدار گوپال شندے کے منہ سے چیخ نکل پڑی۔ اس کے گلے سے خون کے پھوارے چھوٹ گئے۔ سارا بدن لرزنے لگا۔ باہیں پھڑ پھڑانے لگیں۔ اس کا سر دھڑ سے الگ ہو چکا تھا۔ آج پھر بستر پر پڑی سفید چادر لال خون سے رنگ گئی۔ عذرا اطمینان سے اس کے تڑپتے جسم کو دیکھتی رہی جو جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اسے یہ تماشا دیکھنے میں راحت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کہیں ترحم یا ہمدردی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے برعکس وہاں خشم اور انتقام کے ملے جلے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔ اسے اپنے کیے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے یہ ناسور اتنے دن اپنے ذہن کے اندر پال رکھا تھا اور آج جا کر اس سے رہائی پانے کا موقع ملا۔

عذرا کہیں بھی نہ گئی۔ بس اُدھر ہی بیٹھی رہی۔ رات یونہی بیت گئی اور صبح ہوتے ہی یہ بات آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ لیکن آج اس کے چہرے پر نہ کہیں کوئی ڈر تھا اور نہ ہی خوف۔ وہ اتنے برسوں سے حوالدار کے ذاتی جیل خانے میں بند تھی۔ اب گورنمنٹ کے جیل خانے میں منتقل ہو رہی تھی۔ بس چار دیواریاں بدل رہی تھیں، باقی سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔

طالبِ بہشت

وہ دن ہی کچھ منحوس سا تھا۔ معمول کی طرح سکول میں صبح کی مجلس کا انعقاد ہوا۔ بچے خوش وخرم، چہچہاتے ہوئے اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے گراونڈ میں جمع ہوئے۔ ان کے سامنے اساتذہ تھے جو ان کو قطاروں میں کھڑے رہنے کی ہدایت دے رہے تھے۔ کچھ طلبہ ایسے بھی تھے جنھوں نے پہلی بار سکول میں داخلہ لیا تھا اور اجنبی ماحول سے دست و گریبان تھے۔ جغرافیہ اور کیمسٹری کی استانیوں نے کچھ ہی دن قبل نوکری جوائن کر لی تھی۔ بہت کوشش کر کے انھوں نے اپنے مجازی خداؤں کو باور کرایا تھا کہ معلّمی ایک نیک و صالح پیشہ ہے اور ملک کو اچھے اور مخلص اساتذہ کی سخت ضرورت ہے۔ پھر گھر میں زیادہ آمدنی آنے کی وجہ سے ان کے بچے اچھے سکولوں میں تعلیم بھی تو حاصل کر سکتے ہیں۔

کچھ لمحوں بعد پرنسپل صاحبہ وارد ہوئی۔ اس کا چہرہ رعب داب کا اشتہار بنا ہوا تھا۔ یکا یک ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد علامہ اقبال کی دعا فضا میں گونجنے لگی:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری — زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے — ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

.... — ....

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو — نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

دعا کے اختتام پر پرنسپل صاحبہ نے معمول کی طرح طلبہ کو چند نصیحتیں دے ڈالیں اور سکول میں ڈسپلن قائم رکھنے پر زور دیا۔ ویسے بھی سکول میں سخت نظم و ضبط کی فضا بنی ہوئی تھی۔ لیکن سیکورٹی

کے بارے میں کبھی کسی نے سوچا بھی نہیں کیونکہ ایک تو آرمی پبلک سکول تھا اور وہ بھی فوجی چھاونی کے بیچوں بیچ۔ دعائیہ مجلس کے فوراً بعد سبھی طلبہ اپنے اپنے کلاس روم میں چلے گئے۔ طلبہ کے پیچھے پیچھے ان کے استاد بھی چلے گئے۔ ایک اور تھکا دینے والا دن ان کے سر پر تھا۔

قریب ساڑھے دس بجے پورے سکول میں سراسیمگی پھیل گئی۔ فرنٹیر کور کی وردی پہنے کئی خودکار بندوق بردار قبرستان سے ملحق عقبی دیوار پھاند کر اندر آ گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ ان کی تعداد سات تھی اور وہ تحریک طالبان پارٹی کے رکن تھے۔ ان میں تین عربی، ایک چیچین اور دو افغانی تھے۔ سنا ہے کہ انھوں نے اس کارروائی سے پہلے کئی بار اس جگہ کا گشتی معائنہ کیا تھا تا کہ واردات انجام دینے میں کوئی چوک نہ ہو۔ تبھی تو وہ دوڑتے ہوئے سیدھے مرکزی آڈیٹوریم تک پہنچ گئے جہاں بہت سارے طلبہ تربیت پانے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ راستے میں وہ اندھا دھند فائرنگ کرتے چلے گئے۔ آڈیٹوریم کے دروازے پر ایک معلّمہ نے ان کو بہت دیر تک روکے رکھنے کی کوشش کی تا کہ طلبہ کو بھاگنے کا زیادہ سے زیادہ وقت مل جائے۔ گولیوں کی آواز سنتے ہی بچوں میں دہشت پھیل گئی۔ انھیں جہاں کہیں بھی دروازہ یا کھڑکی دکھائی دی، وہیں سے بھاگنے لگے۔ اس کے باوجود کئی بچوں کے معصوم، بے ریا اور بے خطا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے اور بہت سارے زخموں سے تڑپتے رہے۔ معلّمہ کے سینے میں بھی کئی گولیاں اتر گئیں پھر بھی اس نے حتی الامکان کوشش کی کہ دہشت گرد آگے نہ بڑھ سکیں۔ وہ تب تک بچوں کو بچانے کی کوشش کرتی رہی جب تک خون میں لت پت اس کا جسم بے حس و حرکت زمین پر نہ گر پڑا۔

میمونہ کئی سالوں سے سکول میں کام کرتی تھی۔ البتہ اس کی پھولوں کی سیج ابھی تک سوکھی نہ تھی۔ ڈیوٹی کو فریضہ سمجھ کر وہ شادی کے چوتھے ہی دن سکول میں حاضر ہوئی تھی۔ آج اس نے سیکڑوں ماؤں کی کوکھ بھری پری رکھنے کے لیے اپنی کوکھ قربان کر دی۔

کبھی کبھی لگتا ہے کہ بنی نوع انسان جنت کی طلب میں اپنی خوبصورت زمین کو جہنم بنانے

پر تلا ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تعمیر و تخریب دونوں انسان کی سرشت کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ جبلی خصلتیں اور غیر فطری عقیدے انسان کو ایسے کام کرنے پر اکساتے ہیں جنھیں معقول انسان دائرۂ تہذیب سے خارج سمجھتا ہے۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ اگر انسان صرف اپنی بہیمی جبلتوں کے تابع رہے تو وہ تخریبی کارروائی سے باز نہیں رہ سکتا۔ ایک جانب دنیا کی آبادی کا بیشتر حصہ ناخواندہ ہے۔ وہ برے بھلے کی تمیز نہیں کر پاتا۔ دوسری جانب چند طاقت ور لوگ زندگی کی آسائشوں وسہولتوں کی مسلسل فراہمی کے لیے غریب نہتے عوام کو دامے درمے وقلمے اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور ان کے توسل سے اپنا الوسیدھا کرتے ہیں۔ اپنا منصب پانے کے لیے وہ اکثر مذہب، نسل، قومیت اور طبقاتی کشمکش کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ کہاں چاہیں گے کہ غریبوں کی اولادیں پڑھیں، لکھیں اور تعلیم یافتہ بن جائیں۔ انھیں معلوم ہے کہ تعلیم کا پھیلاؤ ان کے اقتدار کا خاتمہ ہے۔ سکول ، کالج اور یونیورسٹیاں ان کے استبداد کے لیے براہ راست چنوتیاں ہیں۔ پاکستان ہو یا ہندستان، افغانستان ہو یا عراق، سوڈان ہو یا نائجیریا، ہر جگہ تعلیمی ادارے ان خود ساختہ عاملِ اخلاق کے نشانے پر رہتے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں کو آئے روز نذر آتش کیا جاتا ہے۔ نرینہ جبریت لڑکیوں کے لیے سکول کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ لڑکیوں کو گھر میں قید کرنے کے فرمان جاری ہوتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایسے لوگ ظاہراً دورِ قدیم کو تہذیب کا سنہری دور مانتے ہیں جب انسان تیر و تفنگ لے کر میدان جنگ میں اترتا تھا، اکثر مائیں زچگی میں راہ عدم اختیار کرتی تھیں اور بچے جنم لیتے ہی خدا کو پیارے ہو جاتے تھے۔ مگر دیکھا جائے تو یہ لوگ خود موڈرن تکنالوجی کی ایجادات واختراعات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ جدید ہسپتال، دوائیاں، موبائل فون، ہوائی جہاز اور ٹیلی ویژن سب ان کو دستیاب رہتے ہیں۔ جدید ترین گاڑیوں میں براجمان، بدن پر بُلٹ پروف جیکٹ، کندھوں پر ترقی یافتہ ملکوں میں بنائے گئے راکٹ لانچر اور ہاتھوں میں مشین گن، کلاشنکوف اور گولی بارود لے کر یہ لوگ دنیا بھر میں دہشت کا راج قائم کرنے کے خواہاں ہیں

کے بارے میں کبھی کسی نے سوچا بھی نہیں کیونکہ ایک تو آرمی پبلک سکول تھا اور وہ بھی فوجی چھاونی کے بیچوں بیچ۔ دعائیہ مجلس کے فوراً بعد سبھی طلبہ اپنے اپنے کلاس روم میں چلے گئے۔ طلبہ کے پیچھے پیچھے ان کے استاد بھی چلے گئے۔ ایک اور تھکا دینے والا دن ان کے سر پر تھا۔

قریب ساڑھے دس بجے پورے سکول میں سراسیمگی پھیل گئی۔ فرنٹیر کور کی وردی پہنے کئی خودکار بندوق بردار قبرستان سے ملحق عقبی دیوار پھاند کر اندر آ گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ ان کی تعداد سات تھی اور وہ تحریک طالبان پارٹی کے رکن تھے۔ ان میں تین عربی، ایک چیچین اور دو افغانی تھے۔ سنا ہے کہ انھوں نے اس کارروائی سے پہلے کئی بار اس جگہ کا گشتی معائنہ کیا تھا تاکہ واردات انجام دینے میں کوئی چوک نہ ہو۔ تبھی تو وہ دوڑتے ہوئے سیدھے مرکزی آڈیٹوریم تک پہنچ گئے جہاں بہت سارے طلبہ تربیت پانے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ راستے میں وہ اندھا دھند فائرنگ کرتے چلے گئے۔ آڈیٹوریم کے دروازے پر ایک معلّمہ نے ان کو بہت دیر تک روکے رکھنے کی کوشش کی تاکہ طلبہ کو بھاگنے کا زیادہ سے زیادہ وقت مل جائے۔ گولیوں کی آواز سنتے ہی بچوں میں دہشت پھیل گئی۔ انھیں جہاں کہیں بھی دروازہ یا کھڑکی دکھائی دی، وہیں سے بھاگنے لگے۔ اس کے باوجود کئی بچوں کے معصوم، بے ریا اور بے خطا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے اور بہت سارے زخموں سے تڑپتے رہے۔ معلّمہ کے سینے میں بھی کئی گولیاں اتر گئیں پھر بھی اس نے حتی الامکان کوشش کی کہ دہشت گرد آگے نہ بڑھ سکیں۔ وہ تب تک بچوں کو بچانے کی کوشش کرتی رہی جب تک خون میں لت پت اس کا جسم بے حس و حرکت زمین پر نہ گر پڑا۔

میمونہ کئی سالوں سے سکول میں کام کرتی تھی۔ البتہ اس کی پھولوں کی سیج ابھی تک سوکھی نہ تھی۔ ڈیوٹی کو فریضہ سمجھ کر وہ شادی کے چوتھے ہی دن سکول میں حاضر ہوئی تھی۔ آج اس نے سیکڑوں ماؤں کی کوکھ بھری پری رکھنے کے لیے اپنی کوکھ قربان کر دی۔

کبھی کبھی لگتا ہے کہ بنی نوع انسان جنت کی طلب میں اپنی خوبصورت زمین کو جہنم بنانے

پر تلا ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تعمیر و تخریب دونوں انسان کی سرشت کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ جبلی خصلتیں اور غیر فطری عقیدے انسان کو ایسے کام کرنے پر اکساتے ہیں جنھیں معقول انسان دائرۂ تہذیب سے خارج سمجھتا ہے۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ اگر انسان صرف اپنی بہیمی جبلتوں کے تابع رہے تو وہ تخریبی کارروائی سے باز نہیں رہ سکتا۔ ایک جانب دنیا کی آبادی کا بیشتر حصہ ناخواندہ ہے۔ وہ برے بھلے کی تمیز نہیں کر پاتا۔ دوسری جانب چند طاقت ور لوگ زندگی کی آسائشوں وسہولتوں کی مسلسل فراہمی کے لیے غریب نہتے عوام کو دامے درمے وقلمے اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور ان کے توسل سے اپنا الوسیدھا کرتے ہیں۔ اپنا منصب پانے کے لیے وہ اکثر مذہب، نسل، قومیت اور طبقاتی کشمکش کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ کہاں چاہیں گے کہ غریبوں کی اولادیں پڑھیں، لکھیں اور تعلیم یافتہ بن جائیں۔ انھیں معلوم ہے کہ تعلیم کا پھیلاؤ ان کے اقتدار کا خاتمہ ہے۔ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ان کے استبداد کے لیے براہ راست چنوتیاں ہیں۔ پاکستان ہو یا ہندستان، افغانستان ہو یا عراق، سوڈان ہو یا نائجیریا، ہر جگہ تعلیمی ادارے ان خود ساختہ عاملِ اخلاق کے نشانے پر رہتے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں کو آئے روز نذر آتش کیا جاتا ہے۔ نرینہ جبریت لڑکیوں کے لیے سکول کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ لڑکیوں کو گھر میں قید کرنے کے فرمان جاری ہوتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایسے لوگ ظاہراً دورِ قدیم کو تہذیب کا سنہری دور مانتے ہیں جب انسان تیر و تفنگ لے کر میدانِ جنگ میں اترتا تھا، اکثر مائیں زچگی میں راہِ عدم اختیار کرتی تھیں اور بچے جنم لیتے ہی خدا کو پیارے ہو جاتے تھے۔ مگر دیکھا جائے تو یہ لوگ خود موڈرن ٹکنالوجی کی ایجادات واختراعات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ جدید ہسپتال، دوائیاں، موبائل فون، ہوائی جہاز اور ٹیلی ویژن سب ان کو دستیاب رہتے ہیں۔ جدید ترین گاڑیوں میں براجمان، بدن پر بُلٹ پروف جیکٹ، کندھوں پر ترقی یافتہ ملکوں میں بنائے گئے راکٹ لانچر اور ہاتھوں میں مشین گن، کلاشنکوف اور گولی بارود لے کر یہ لوگ دنیا بھر میں دہشت کا راج قائم کرنے کے خواہاں ہیں

۔کاش کوئی ان سے صرف اتنا پوچھے کہ جن ہتھیاروں سے تم لیس ہوان میں سے کتنے تم نے ایجاد کیے ہیں اور کتنے تمھارے ملک میں بنتے ہیں؟ پھر بھی نہ جانے کیوں یہ لوگ ملک کی ترقی کو روکنے میں ہی خوش ہیں۔

میمونہ فوج کے افسر کی بیٹی تھی۔اس نے بچپن ہی سے ہمت وحوصلے کو اپنا شعار بنایا تھا۔ وہ ایک کوکھ کیا ہزاروں کوکھیں اپنے مادر وطن کے نونہالوں کے لیے قربان کرنے کو تیار تھی۔ کچھ جیالے ایسے بھی ہوتے ہیں جو نقیبانِ تاریکی سے مرغوب نہیں ہوتے۔لہو کے بہتے دریاؤں، خون سے رنگی وردیوں، لال چھینٹوں سے گلکاری کی ہوئی عبادت گاہوں سے مرعوب نہ ہوکر وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔انھیں یقین ہوتا ہے کہ ان کی امنگوں کا سورج کبھی نہ کبھی ضرور طلوع ہوگا۔اسی نئی صبح کی آرزو میں کروڑوں بچے ہر صبح اندھیروں کو مٹانے کے لیے اجالے کی دعائیں کرتے ہیں۔

پرنسپل صاحبہ گولیوں کی آوازیں اور شور وغل سن کر فوراً پولیس، ہسپتال اور کچھ نزدیکی والدین کو اطلاع دینے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ ہی وقفے میں سکول کو پاکستانی سپیشل سیکورٹی گارڈز نے گھیر لیا۔انھوں نے دہشت گردوں کی ناکہ بندی کرکے ان کے بھاگنے کے تمام راستے بند کرلیے۔تاہم مزید قتل وغارت روکنے کے لیے صبر وتحمل سے کام لیتے رہے۔دہشت گرد کمرہ بہ کمرہ جاکر بچوں کو ڈھونڈ رہے تھے اور پھر کچھ ہی لمحوں میں پرنسپل کے کمرے تک جا پہنچے جہاں کئی بچوں نے پناہ لی تھی۔وہ کونوں چھدروں میں دبک کر چھپ گئے تھے یہاں تک کہ اپنی سانسیں بھی روک رکھی تھیں۔دو دہشت گردوں نے دروازے سے اندر آتے ہی پرنسپل کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنالیا اور وہ خون سے لت پت اپنی کرسی پر ہی ڈھیر ہوگئی۔معصوم بچے اپنی آنکھوں سے یہ مکروہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہہ رہے تھے۔دریں اثنا سیکورٹی فورسز کے جوان بھی اندر آئے اور انھوں نے دونوں دہشت گردوں کو مار گرایا مگر پرنسپل کو بچا نہ سکے۔

اُدھر ایک افغانی دہشت گردنوبں کے کلاس روم میں گھس گیا جہاں فوزیہ بچوں کو مرغی کی طرح اپنی حفاظت میں لیے بیٹھی تھی۔اس کے چہرے پر خوف وڈر کے آثار بالکل نہ تھے۔وہ بچوں کو باہمت اور خاموش رہنے کی ہدایت دے رہی تھی۔ بہت برس پہلے وہ خود بھی افغانستان سے رفیوجی بن کر آئی تھی۔ پشاور میں اس نے پوسٹ گریجویشن اور بی ٹی کی ڈگریاں امتیاز کے ساتھ حاصل کی تھیں اور پھر اس سکول میں استانی بن گئی تھی۔ پھر بھی وہ اپنے ماضی کو بھلا نہیں پائی۔اسے یاد تھا کہ کیسے اس کے والد کو سر بازار گولیوں سے بھون دیا گیا تھا اور اس کی ماں اور وہ گھاس سے لدی ہوئے ٹرک میں سرحد پار کرنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔اس کے باپ کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ لڑکیوں کا سکول چلاتا تھا اور ان کو علم کے زیور سے آراستہ کر رہا تھا۔کئی بار دھمکیاں ملنے کے باوجود اس نے سکول کو بند نہیں کیا۔فوزیہ اسی مجاہد کی بیٹی تھی۔ اسی دن اس نے قصد کیا تھا کہ وہ معلمی کو ہی اپنا پیشہ بنائے گی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے محبوب جابر خان نے بھی اسلحہ اٹھائے تھے۔فوزیہ نے کئی بار اس کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یہ راستہ اجالے کے بدلے اندھیرے کی طرف جاتا ہے مگر جابر پر تو تطہیر معاشرہ کا بھوت سوار ہو چکا تھا وہ کہاں مانتا۔اس کے سامنے عورت کی کیا وقعت تھی کہ وہ اس کی بات مان لیتا۔عسکری صحرا میں وہ بہت دور چلا گیا اور فوزیہ صرف اس کو پکارتی رہ گئی۔ پہلے والد کے جانے کا غم اور پھر محبوب کے بچھڑنے کا غم! کتنے صدمے برداشت کر کے فوزیہ نے اپنی مٹی، اپنی دھرتی کو الوداع کہا تھا اور گھاس کی ٹرک میں چھپ کر ماں کے ساتھ یہاں پہنچ گئی تھی۔

''فوزیہ.......!تم....؟'' ہاتھ میں کلاشنکوف لیے اور چہرے پر کالا ڈھاٹا باندھے دہشت گرد نے سوال کیا۔

فوزیہ حیران ہوگئی کہ یہ آواز کس کی تھی؟اس نقاب پوش کو میرا نام کیسے معلوم ہے؟ آواز تو کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔وہ پھر بھی خاموشی سے اس مداخلت کار کی حرکتوں کو دیکھتی رہی۔

''فوزیہ، مجھے نہیں پہچانا۔ میں ہوں جابر.....تمہارا جابر!'' نقاب پوش نے اپنا ماسک چہرے سے ہٹالیا۔

''جابر.... !وہ تو اسی روز مر گیا جب اس نے میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود اپنے ہاتھوں میں کلاشنکوف اٹھالیا۔ میرا جابر تو کب کا مر چکا ہے۔ تم تو بس ایک دہشت گرد ہو اور کچھ بھی نہیں۔ تمھارے ہاتھوں میں نہ جانے کتنے معصوم بچوں کا خون لگا ہوا ہے۔'' فوزیہ نے دوٹوک جواب دیا۔

''نہیں فوزیہ، تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات پر گامزن ہوں۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم۔ ہم دونوں بچپن میں ایک ہی مدرسے میں قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مجھے بتاؤ کس دن مولوی صاحب نے قتل وغارت اور معصوموں کو تہ تیغ کرنے کا سبق دیا تھا؟ یہ تو تمھاری بھول ہے۔ تم غلط لوگوں کے ساتھ ہو لیے۔ اپنے ذہن کے بدلے اپنے آقاؤں کے ذہن سے سوچنے لگے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو، یہ خدا کا فرمان نہیں ہے۔ خدا کا فرمان ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے تمھیں چین بھی جانا پڑے تو چلے جاؤ۔ علم ہی نور ہے اور علم ہی بصیرت عطا کرتی ہے۔ تم اندھیروں میں بھٹک رہے ہو۔''

''مگر تم سمجھتی کیوں نہیں۔ ان فوجیوں نے بھی تو ہمارے بال بچوں کو مار ڈالا۔''

''کیوں مار ڈالا؟ ملک میں اتنی آبادی ہے ان پر بمباری کیوں نہیں کرتے؟ یہ کبھی سوچا ہے۔ دراصل اپنے بال بچوں کو تم نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ ان کی موت کے ذمے دار تم لوگ ہو جنھوں نے ان کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ فوج تو ملک کی حفاظت کر رہی ہے اور اس کو پراگندہ ہونے سے بچا رہی ہے۔''

فوزیہ کی شخصیت سے مرعوب ہو کر وہ کچھ دیر کے لیے گولیاں چلانا بھول گیا۔ بڑی مدت کے بعد اسے اپنی محبوبہ کا سامنا ہوا اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یہی

وجہ تھی کہ کچھ ساعتوں کے لیے اس کا کلاشنکوف خاموش ہو گیا۔

اُدھر سیکورٹی فورسز نے اس کے سبھی ساتھیوں کو ایک ایک کر کے مار ڈالا اور یرغمالی بچوں کو چھڑوا دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب بچے اور اساتذہ مارے گئے جبکہ تین سو سے زیادہ بچے زخمی ہو گئے۔ یہ اعداد و شمار حکومت کی طرف سے جاری ہوئے تھے مگر جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، مرے ہوئے اور یرغمال شدہ افراد کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

''جابر، میں بھی افغان ہوں، مجھے بھی یہ کھلونے چلانے آتے ہیں اور شاید تم سے زیادہ طاقت ور اور بہادر بھی ہوں۔'' اتنا کہہ کر جونہی جابر کا دھیان بٹ گیا فوزیہ نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی، اس کو پٹک کر زمین پر گرا دیا اور بندوق کی نلی جابر کے سینے پر رکھ دی۔

جابر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی اس کو یہ منظر بھی دیکھنا پڑے گا۔ ''فوزیہ، یہ تم کیا کر رہی ہو۔ اپنے جابر کو مارو گی کیا؟''

''اپنا جابر.....؟ کہاں ہے وہ.....؟ میرے سامنے تو کوئی اور ہے جس کے ساتھیوں نے میرے والد کو مار ڈالا...... جس کے آقاؤں نے مجھے اور میری والدہ کو گھر سے بے گھر کر دیا..... جس نے میری دھرتی کو قبرستان بنا دیا...... جس نے میرے وطن میں علم کی شمع بجھا دی۔ یہ وہ جابر خان نہیں ہے جو کبھی میرا محبوب ہوا کرتا تھا۔ وہ تو کب کا مر چکا ہے۔ یہ تو انسانیت کا دشمن ہے۔''

دریں اثنا فوزیہ نے بچوں کو باہر جانے کا اشارہ کر دیا اور وہ سبھی بچے، ڈرے سہمے ہوئے ،کلاس روم چھوڑ کر بھاگ گئے۔

''فوزیہ تم گولی نہیں چلانا۔ میرے جسم پر خودکش بم لگا ہوا ہے۔ دھماکہ ہو جائے گا اور تم مر جاؤ گی۔ میں تمھیں مرتا نہیں دیکھ سکتا۔''

''خودکش بم...! ہاہاہا...! جنت جانے کی پوری تیاری کر کے آئے ہو۔ پھر تو تمھیں وہاں تک پہنچانا کار ثواب ہے۔''

''فوزیہ، کچھ اپنا بھی سوچ لو۔ تم خود بھی مر جاؤ گی۔''

''موت سے بزدل ڈرتے ہیں جابر خان۔ میں اس باپ کی بیٹی ہوں جس نے ہنستے ہنستے جان دے دی مگر سکول بند نہیں کیا۔ مجھے ان کھلونوں سے ڈر نہیں لگتا۔ موت تو یوں بھی تمھارے سر پر ناچ رہی ہے۔'' اور فوزیہ نے کلاشنکوف کی لبلبی دبا دی۔

اس کے ساتھ ہی زوردار دھماکہ ہوا۔ جابر کا وجود آگ کی شعلوں کی نذر ہو گیا۔ وہ تب تک تڑپتا رہا جب تک اس کا جسم جل کر راکھ ہو گیا۔

فوزیہ بھی لقمۂ اجل ہو گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے ہمت و حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا اور تیس کے قریب بچوں کی جانیں بچائی تھیں۔

☆☆☆☆☆

ایک بے کار آدمی کی کہانی

اس نے خود کو کبھی بے کار نہیں سمجھا۔ نہ اُس وقت، جب وہ گرلز کالج کے گیٹ کے باہر سفید خوبصورت کبوتریوں کی آمد و رفت سے اپنی آنکھوں کو طراوت پہنچاتا تھا اور نہ اب جب وہ گھر میں بیٹھا بیوی کے لوٹ آنے کا انتظار کرتا ہے۔ لڑکپن میں والدین نے خوب سمجھایا کہ تعلیم سے تقدیر بدل جاتی ہے مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ ایک سیدھی سادی، حسین اور پیار کی بھوکی لڑکی نرغے میں پھنس گئی۔ لڑکا جوان، خوبرو، ہنس مکھ اور خوش لباس تو تھا ہی، اپنی پُرکشش شخصیت کو بطور پریم بان استعمال کیا اور لڑکی کو اپنے دام میں پھنسایا۔ اس کے بعد شیاما خود کو کبھی آزاد نہ کر پائی۔

اجودھیا ناتھ کتنی بار بی اے کے امتحان میں شریک ہوا تھا اسے یاد بھی نہیں۔ ہر سال والدین کو یقین دلاتا کہ اب کی بار میں ضرور پاس ہو جاؤں گا مگر قسمت نے کبھی ساتھ نہ دیا۔ بھولے بھالے اور سریع الاعتقاد والدین کے پاس اس پر اعتبار کرنے کے بغیر چارہ بھی تو نہ تھا۔ اس کا دوست، جو کچھ برس پہلے اس کا ہم جماعت تھا، انجینئرنگ مکمل کر کے نوکری بھی لگ گیا مگر وہ ابھی بھی امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ماں نے تھک ہار کر ایک روز اس کے انجینئر دوست سے پوچھا، ''بیٹے کچھ اپنے دوست کو بھی سمجھایا کرو، کچھ پڑھے لکھے، محنت کرے اور انسان بنے۔ وہ تو کئی برسوں سے بی اے میں اٹک گیا ہے۔''

دوست نے جواب دیا۔ ''آنٹی، وہ کیا خاک پڑھے گا، صبح کالج کے لیے نکلتا ہے اور جا کر گرلز کالج کے گیٹ پر لڑکیوں کو دیکھتا رہتا ہے اور ان پر پھبتیاں کستا ہے۔''

ماں ہنس دی۔ ''ارے بیٹا، کیا کروں، اس کو لڑکیاں بہت پسند ہیں۔ جاتا ہوگا دل بہلائی کے لیے۔''

دوست کے جی میں آئی کہ کہہ دے ''آنٹی، میں کوئی نامرد ہوں کیا کہ مجھے لڑکیاں پسند نہیں آتیں۔ آدمی کو زندگی میں کچھ تو ترجیحات ہونی چاہئیں۔'' مگر عمر کا لحاظ کر کے وہ کچھ بھی نہ بول پایا اور چپ چاپ اپنے گھر چلا گیا۔

ایک روز ماں کو معلوم ہوا کہ پھر سے نتیجے آنے والے ہیں۔ بہت پریشان ہوئی کہ نہ جانے کیا ہوگا۔ اس نے کئی بار اپنے بیٹے کے منہ سے سنا تھا کہ اب کی بار اگر وہ پاس نہیں ہوا تو خود کشی کر لے گا۔ اسے فکر لگی کہ نہ جانے اس کا بیٹا کہاں ہوگا کیونکہ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس بار فیل ہوا تو زہر کھا لے گا۔ ماں نے اس کے ایک اور قریبی دوست کو بلوایا اور اس سے گزارش کی۔ ''بیٹے، نہ جانے اجودھیا کہاں ہوگا۔ سنا ہے اس کا رزلٹ نکل چکا ہے اور وہ دوبارہ فیل ہو چکا ہے۔ کہیں سن کے کچھ کر نہ بیٹھے۔ اس لیے اس ماں کی لاج رکھو اور جا کر اسے ڈھونڈ لاؤ۔ وہاں پر اسے رزلٹ کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔''

دوست کو معلوم تھا کہ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ وہ سیدھا خیبر سینما پہنچا جہاں کا گیٹ کیپر جان پہچان کا آدمی تھا۔ اس کو ساری بات سمجھائی اور اجودھیا ناتھ کو باہر بلوایا۔ دوست گویا ہوا۔ ''بھئی جلدی گھر چلو۔ تمھاری ماں بہت پریشاں ہے۔ تمھارے رزلٹ کا اعلان ہو چکا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اس کو بلا کر لے آؤ تا کہ رزلٹ معلوم کرنے جائے۔''

اجودھیا نے پھیکی سی ہنسی ہنس دی اور پھر دوست سے مخاطب ہوا۔ ''ارے بھائی، وہاں کیا دیکھنا ہے۔ مجھے تو اپنا رزلٹ معلوم ہی ہوتا ہے۔ تم تو میرے دوست ہو، میرے لیے ایک کام کر لو، گھر جا کر ماں سے کہہ دو کہ بہت کوشش کے باوجود اجودھیا کہیں نہیں ملا۔ نیا فلم ہے اور ہیرو بھی میرا پسندیدہ ہے۔ بلیک میں ٹکٹ خرید لی ہے۔ مجھے یہ فلم پورا دیکھنے دو۔ ختم ہوتے ہی گھر پہنچ

جاؤں گا۔ تب تک تم کیسے بھی مورچہ سنبھالو۔'' یہ کہہ کر وہ دوڑتا ہوا سینما ہال کے اندر چلا گیا۔

دوست کو پہلے ہی سے اس جواب کی توقع تھی پھر بھی ماں کا دل رکھنے کے لیے چلا گیا۔ دو گھنٹے کے بعد صاحب زادہ غمگین سا چہرہ بنا کر چلا آیا اور ماں سے لپٹ کر بولا۔ ''مجھے گھر آتے وقت ایک ہم جماعتی نے نتیجے کے بارے میں آگاہ کیا۔ معلوم نہیں ان یونیورسٹی والوں کو میرے ساتھ کیا بیر ہے کہ پاس ہی نہیں کرتے۔''

ماں زار و قطار روتی رہی اور بیٹا رونی صورت بنا کر سامنے بیٹھا رہا۔

کئی برس یوں ہی گزر گئے۔ پھر تھک ہار کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ گیا۔ کرتا بھی کیا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ والدین نے اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے شیاما کو قربانی کا بکرا بنا لیا۔ تقدیر اچھی تھی کہ شیاما کو سرکاری ادارے میں نوکری مل گئی جس کے سبب گھر کے اخراجات پورے ہوتے رہے۔ اجودھیا بدستور آوارہ دوستوں کی منڈلیوں میں گپیں ہانکتا رہا۔ گاہے دُکانوں کے تھڑوں پر، گاہے سرکاری پارکوں میں اور گاہے سڑکوں پر بے سمت چل کر۔ شام کو آتے ہی تھکی ماندی بیوی کی آغوش میں پناہ لیتا۔ طفیلی زندگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو دوسروں پر اپنا بوجھ لادتے ہیں اور خود بے نیل و مرام جیتے ہیں۔

بہر حال ایسا کب تک چل سکتا تھا۔ والدین اس فکر میں تھے کہ بیٹے کو کہیں کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل جائے۔ مندروں آستانوں میں حاضری دی۔ پیر فقیروں کے در پر سجدے کیے۔ گنڈے تعویز باندھے۔ آخر کار ماں کا سونا بیچ کر تیس ہزار اکٹھے ہوئے اور انھیں نذرانہ دے کر ایک سرکاری محکمے میں عارضی طور پر ملازمت مل گئی۔ امید یہ تھی کہ دو تین برسوں میں مستقلی ہو جائے گی۔ ہوا بھی یہی ساڑھے تین سال بعد سبھی عارضی ملازموں نے مورچہ لگایا، ہڑتالیں کیں اور کام روکو تحریک چلائی۔ بڑے بڑے یونین لیڈروں نے ان کو اپنا سمرتھن دیا۔ خوش نصیبی یہ رہی کہ الیکشن سر پر تھا اس لیے سرکار ان کی مانگیں ماننے کے لیے مجبور ہو گئی۔

دراصل گورنمنٹ دفتروں میں یہ ایک نئی وبا پھیلی ہے۔ سرکاری خرچ کو کم کرنے کے لیے دکھاوے کے لیے تقرریوں پر روک لگائی جاتی ہے جبکہ دوسری جانب ہنگامی صورت میں احتیاج کے تحت ایسے نااہل لوگوں کو عارضی طور نوکری پر رکھا جاتا ہے جو یا تو ان کے قریبی ہوتے ہیں یا پھر جنھوں نے مٹھی گرم کی ہوتی ہے۔ بعد میں عارضی کو مستقل کرنے کے لیے نئے نئے حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ انھیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ سپریم کورٹ کے احکامات کے تحت کسی عارضی ملازم کو تین سال نوکری کرنے کے بعد نکالا نہیں جا سکتا ہے۔ ہندوستانی افسر شاہی کی کارستانیاں.....! جیب بھی گرم ہوئے، سیاسی آقا بھی خوش ہوئے، نہ سرکاری حکم کی ان دیکھی ہوئی اور نہ کورٹ کی توہین ہوئی۔ دوسری جانب تعلیم یافتہ، قابل اور میرٹ والے امیدوار اپنی قسمت اور سرکاری نظام کو کوستے رہ جاتے ہیں۔

خیر آمد بر سر مطلب۔ تیس ہزار کی رقم کام کر گئی۔ اب تو ٹھاٹ تھی۔ سرکاری ملازمت... بالائی آمدنی... نئے سوٹ... نئے جوتے... کبھی کبھار کوئی انڈیا کنگس سگریٹوں کا پیکٹ دے جاتا اور کوئی ہیورڈس کی بوتل پکڑا دیتا۔ کایا پلٹ ہوگئی۔ سچ پوچھو تو گھر پھر بھی شیاما کی تنخواہ پر ہی چلتا تھا۔ اس کی تنخواہ کے مقابلے میں شوہر کی تنخواہ عُشرِ عشیر تھی۔ پھر بالائی آمدنی تو جنس میں ملتی تھی جیسے سگریٹ، بوتل یا فارین سینٹ۔ ان سے کنبے کا کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

کئی برس بعد زندگی نے ایسی کروٹ لی کہ سب کچھ تہس نہس ہوگیا۔ وادی کے چپے چپے پر بارود بچھ گئی۔ سڑکوں پر لہو بہنے لگا۔ رات کی تاریکی میں فرمان اور دھمکیاں جاری ہوئیں۔ اجودھیا، شیاما اور ان کے دو بچوں کو وادی چھوڑ کر جموں میں پناہ لینی پڑی۔ شیاما چونکہ مرکزی محکمے میں ملازم تھی، اس لیے کچھ عرصے بعد اس کو لکھنؤ میں تعینات کیا گیا۔ سارا کنبہ لکھنؤ منتقل ہوگیا اور آہستہ آہستہ نئے ماحول اور نئی چنوتیوں کا مقابلہ کرنے میں منہمک ہوگیا۔

کرائے پر سستا فلیٹ پندرہ کلومیٹر دور مل گیا۔ شیاما صبح سے لے کر آدھی رات تک پہلے

دفتر اور پھر گھر کے جھمیلے سلجھاتی رہی۔ ادھر بچوں کے اخراجات بڑھتے گئے۔ سکول کی فیس، کپڑا لتا، جیب خرچ اور پھر ٹیوشن کا خرچہ! اجودھیا چونکہ ریاستی سرکار میں ملازم تھا اس لیے گھر بیٹھے تنخواہ ملنے لگی مگر اب بالائی آمدنی بند ہو چکی تھی۔ سگریٹ وغیرہ کے لیے جیب سے خرچ کرنا پڑتا تھا مگر وہ ٹھاٹ اب کہاں!

وہ من ہی من میں بہت خوش تھا کہ گھر بیٹھے ہر مہینے تنخواہ مل رہی ہے اور کوئی جوکھم بھی اٹھانی نہیں پڑتی۔ جب مرضی جاگو، جب مرضی کھاؤ اور جب مرضی آرام فرماؤ، کوئی بندش نہ تھی۔ ہاں جہاں کہیں کشمیری مہاجروں کی کانفرنس ہوتی، یگیہ ہوتا یا پھر کسی سنت سادھو کی آمد ہوتی، فوراً پہنچ جاتا اور کشمیری پنڈتوں کے مستقبل پر بحث و مباحثے میں حصہ لیتا۔ اچھا فورم تھا جہاں برادری کی خوب ساری خبریں مل جاتیں جن کو وہ آل انڈیا ریڈیو کی مانند نشر کرتا۔ کس کا بیٹا ایم بی کر کے امریکا چلا گیا، کس کی بیٹی انجینئر نگ کر کے جرمنی میں بیاہی گئی، کس کی لڑکی کس کے ساتھ بھاگ گئی، کس جوڑے کا حال ہی میں جھگڑا ہوا اور کس نے زہر کھا کر جان دی، اجودھیا ناتھ ان سب خبروں کا پٹارا تھا۔ مگر گھر پہنچتے ہی یہ بیماری اور وہ بیماری۔ کام کرنے کی سکت ہی نہ رہتی تھی۔

چند قریبی رشتے داروں نے بہت کوشش کی کہ اجودھیا ناتھ گھر کا ایک فرض شناس رکن بن جائے۔ کوئی پرائیویٹ ملازمت کر کے مزید آمدنی گھر لائے جو مستقبل میں بچوں کے کام آسکے۔ یہاں تک کہ ایک بارسوخ رشتے دار نے اچھی خاصی نوکری دلوا دی۔ مگر پرائیویٹ نوکری میں محنت کرنی پڑتی۔ نہ وہ سرکاری نوکری کی ٹھاٹ باٹ تھی اور نہ ہی بالائی آمدنی۔ نہ فلٹر سگریٹ تھے اور نہ تکے کباب۔ دن بھر پسینے بہانے والا معاملہ تھا گو پرانی نوکری کے مقابلے میں پانچ گنا تنخواہ ملنے والی تھی۔ بیچارے نے دس بارہ روز حاضری دی پھر بیمار پڑ گیا اور بہت دنوں تک بستر پر پڑا رہا۔ اس طرح نوکری سے جان چھوٹ گئی اور وہ اندر ہی اندر خوش ہوا۔

صحتیاب ہونے کے بعد شیاما نے پھر کسی کی منت سماجت کر کے پاس ہی ایک این جی

او میں نوکری کا انتظام کروایا۔ زیادہ محنت کا کام نہیں تھا۔ دس سے پانچ تک کی نوکری تھی اور وہ بھی آمدنی اور خرچے کا حساب رکھنا تھا۔ تنخواہ البتہ پہلے جیسی نہ تھی مگر معقول تھی۔ بچنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آئی۔ بے چارا نوکری کرنے ایسے جاتا جیسے سوئے دار جا رہا ہو۔ آخر کب تک۔ پہلے مہینے کی تنخواہ....دوسرے مہینے کی تنخواہ....پھر دل میں گھبراہٹ ہونے لگی، ایک روز دفتر سے لوٹتے وقت غش آ گیا اور ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا۔ انجام کار اس نوکری سے بھی چھٹکارا مل گیا۔

ایسے ہی ایک دو تجربے اور ہوئے مگر صحت کی ناسازی اور سر میں چکر آنے کے بہانے جان چھوٹتی رہی۔ ایک روز بڑا بھائی کولکتہ سے آیا اور بات بات میں نصیحت کرنے لگا۔ ''اجودھیا ، دن بھر یوں ہی پڑا رہتا ہے۔ کچھ کام شام کیا کرو، صحت بھی اچھی رہے گی اور وقت بھی گزر جایا کرے گا۔ ساتھ ہی گھر کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔''

اجودھیا نے جواب دینے میں زیادہ دیر نہ لگائی۔ ''میں کیا گھاس کاٹا رہتا ہوں۔ ہر مہینے سرکار تنخواہ دیتی ہے۔ پھر اور نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

شکر ہے کہ نصیحت دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ اس کا اپنا بڑا بھائی تھا۔ ورنہ بات نہ جانے کہاں تک بڑھ جاتی۔

ادھر اخراجات روز بروز بڑھ رہے تھے۔ اجودھیا ناتھ، جو تب تک 'شیر آیا شیر آیا' کی رٹ لگائے ہوئے تھا اب سچ مچ شیر کی گرفت میں آ گیا۔ ذیابیطس اور قلب کی بیماری نے مستقل طور پر دبوچ لیا۔ اب تو محفلیں بھی چھوٹ گئیں۔ ہجرت کے بعد کشمیری پنڈتوں میں دو چیزیں بہت عام ہو گئیں۔ ایک بسر اوقات کے لیے آشرموں کے چکر لگانا اور دوسرے ذیابیطس کی بیماری جو جونک کی طرح اکثر لوگوں کے ساتھ چمٹ گئی ہے۔ اجودھیا ناتھ کو بھی دونوں نے جکڑ لیا۔ مندر اور آشرم کی لت ایسی پڑی کہ گھنٹوں بیت جاتے گھر کا خیال ہی نہ رہتا۔ اُدھر ذیابیطس نے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ لیا اور حرکتِ قلب نے کئی بار بند ہونے کی دستک دی۔

کچھ لوگوں کے لیے بیمار ہونا بھی افتخار کی علامت ہوتی ہے۔ اجودھیا ناتھ جہاں جاتا سب سے پہلے اپنی بیماری کا بکھان کرتا کہ ''خون میں شکر بہت بڑھ گیا ہے، اس کے لیے ڈاکٹر نے چار دوائیاں دی ہیں۔ پھر فشار خون کی وجہ سے دل پر اثر پڑا ہے اور دو جگہ اپریشن کر کے خون کے بہاؤ کو نارمل کیا گیا۔ اس بیماری سے بچنے کے لیے روزانہ پانچ دوائیاں کھانی پڑتی ہیں۔ کھانے میں سب کچھ بند۔ نمک، چینی، مرچ، مصالحے، آلو اور چاول۔ معلوم نہیں پھر کیسے جئیں گے۔ میں تو آج کل ہوا پر جی رہا ہوں۔''

اور سچ بھی یہی ہے کہ اجودھیا ناتھ نے کبھی اپنے جینے کے ڈھنگ پر غور ہی نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ ہوا پر جیتا رہا۔ کبھی والد کی کمائی نے سہارا دیا، کبھی بیوی کی کمائی نے اور کبھی مفت مل رہی تنخواہ نے۔ کہیں پر بھی اس کو محنت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جیتا رہا، زندگی کے سفر کے سنگ میل طے کرتا رہا اور اب منزل بھی زیادہ دور نہیں رہی۔ طفیلی زندگی نے اسے ایک ہی سبق سکھایا کہ جینے سے مطلب رکھو، اس کی پرواہ نہ کرو کہ کیسے جینا ہے۔ ان بھول بھلیوں میں جھانکنے کی کوشش کرو گے تو زندگی کا سکھ چین کھو دو گے۔

اور اجودھیا ناتھ نے یہ سبق از بر کرلیا ہے۔

گواہوں کی تلاش

میں نے گواہوں کی تلاش میں سارا شہر چھان مارا مگر کوئی گواہی دینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ انھیں عدالت میں جھوٹ نہیں بولنا تھا بلکہ سچائی بیان کرنی تھی، پھر بھی کسی کو میرے ساتھ ہمدردی نہ ہوئی۔ شاید عدالت میں سچ بولنا مشکل ہوتا ہوگا۔نہیں تو سب کے سب انکار کیوں کرتے؟ ہنسی خوشی میری مدد کرتے۔ کچھ مصلحتیں ضرور رہی ہوں گی کہ سب لوگوں نے انکار کردیا۔

ہجرت کے ساتھ آدمی اپنی شناخت بھی کھودیتا ہے اس کا تجربہ مجھے پہلی بار ہوا۔ بات دراصل یوں ہے کہ میں مہاجر ہوں، اپنی دھرتی سے اکھڑا ہوا اور اس نئے انجان شہر میں باقی ماندہ سانسیں مکمل کرنے کے لیے جی رہا ہوں۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ خود اپنا آپ بھی نہیں۔ میں اپنی پہچان پیر پنچال کے اس پار چھوڑ آیا ہوں۔ اس شہر میں میرا پھر سے جنم ہوا ہے.....دوسرا جنم .....اب میں کشمیری مائیگرنٹ کہلاتا ہوں۔ کوئی رفیوجی بھی کہتا ہے!

اجنبی...! بے گھر...! بے زمین...! جڑوں کے بغیر...! اب نہ میرا کوئی ماضی ہے اور نہ مورث اعلیٰ۔ اپنی دھرتی سے اکھڑ کر ہر کوئی اپنی شناخت کھوتا ہے اور پھر ایک نئی پہچان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

آبائی وطن کی بات کچھ دوسری تھی۔ وہاں ہر دوسرے موڑ پر کوئی نہ کوئی شخص ایسا ملتا تھا جو ہاتھ ہلا کر سلام کرتا اور خیر خبر پوچھ لیتا۔ یہاں آئے ہوئے پندرہ سال گزر گئے۔ ابھی تک اپنے ہمسائیوں سے پوری واقفیت نہیں ہوسکی، اجنبیوں کی تو بات ہی نہیں۔ چلتے پھرتے کوئی سلام کر بھی لے تو میں رسماً سلام کا جواب دیتا ہوں اور پھر بہت دیر تک سوچتا ہوں کہ وہ شخص جو سلام کر کے چلا

گیا، کون تھا؟ شاید قصور میرا ہی ہے۔ میں بذاتہٖ دروں بیں ہوں اور میل جول پسند نہیں کرتا۔ دفتر میں بھی لوگوں سے صرف علیک سلیک ہوتی ہے، انھیں کبھی گھر کا راستہ دکھایا نہ اپنی نجی زندگی میں جھانکنے کی اجازت دی۔ میری دوستی گھر کی ڈیوڑھی پر ختم ہو جاتی ہے۔ گھر میں صرف میرا محو بالذات وجود، میرے مطالعہ کا کمرہ اور میری خود غرض محدود دنیا ہوتی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

شاید وہ دن ہی کچھ منحوس سا تھا۔ میں اپنی طلاق کے بارے میں وکیل سے معلومات حاصل کرنے چلا گیا۔ اس نے کیس کی کامیابی کے لیے شرط رکھی کہ مجھے عدالت میں کم سے کم دو گواہ پیش کرنے پڑیں گے۔ کیس دائر کرنے سے پہلے وکیل نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں پورے دن فکر و تردّد کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگاتا رہا۔

''دو گواہ.......! کہاں سے لے آؤں گا؟ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ نہ کوئی جان نہ پہچان۔ کون اس بات کی گواہی دے گا کہ میری اور میری بیوی کی آپس میں نہیں بنتی ہے، وہ ازدواجی مطالبات کو نظر انداز کرتی ہے اور اپنی ہی دنیا میں ہمیشہ کھوئی رہتی ہے۔ اس کی وجہ سے میری زندگی تباہ ہو چکی ہے۔ کسی کو میری ذاتی زندگی سے کیا لینا دینا؟ اس بارے میں جنھیں معلوم تھا وہ یا تو وادی میں رہ گئے یا پھر ٹوٹی ہوئی مالا کے موتیوں کی مانند بکھر گئے۔''

جس سے اپنی طلاق کے بارے میں بات کرتا ہوں وہ کہتا ہے ''کیوں مذاق کر رہے ہو؟'' اسے یقین ہی نہیں آتا۔ دراصل ہماری زندگی سراب کی مانند ہے۔ ہم دونوں کو جو کوئی بھی دیکھتا ہے اسے ہم پر رشک آتا ہے۔ اتنا ملن سار جوڑا دیکھ کر ہر کوئی عش عش کرتا ہے۔ شکل و صورت تو قدرت نے دونوں کو اچھی دے رکھی ہے۔ پھر پارٹیوں میں بھی کھلکھلاتے رہتے ہیں۔ باتیں کرنے میں دونوں ہی تیز طرار ہیں۔ کبھی کسی کے چہرے پر کوئی غم کی لکیر نظر نہیں آتی۔ پھر کسی کو کیسے شک ہو سکتا ہے کہ دونوں جذباتی آتش فشاں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ چہرے پڑھ کر دل کی کیفیت جاننا کتنا مشکل ہے، اس بات کا احساس مجھے گھر لوٹتے وقت ہوتا ہے یا پھر اس وقت جب

کوئی بزرگ ہمیں اکٹھے پا کر آشیرباد دیتا ہے کہ بھگوان نے اتنی حسین جوڑی بنائی ہے، آپ دونوں سلامت رہیں۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب میں نے عدالت کے دروازے کھٹکھٹائے۔اس سے پہلے جہاں میری پوسٹنگ تھی وہاں پر بھی میں نے عدالت میں طلاق کی عرضی دائر کی تھی۔ وہ علاقہ جرائم کے لیے کافی بدنام تھا۔اس لیے لوگوں کے سوچنے کے ڈھنگ میں کجروی ہونا فطری تھا۔جس وکیل کا میں نے انتخاب کیا،اس کا طریقۂ کار بھی کچھ مشکوک تھا۔وکیل نے عرضی میں بہت ساری تہمتیں میری بیوی کے اوپر لگا دیں اور پھر اسے عدالت میں داخل کر دیا۔اس کے بعد مجھ سے کہنے لگا کہ طلاق میں کچھ ٹھوس ثبوت پیش کرنے پڑیں گے۔ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ آپ کی بیوی بدچلن اور بداخلاق ہے اور اس کے تعلقات کسی غیر مرد سے ہیں۔

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے وجود کو جھنجھوڑ دیا ہو۔میں پریشان ہو گیا۔جھوٹ بولنا میرے لیے ناممکن تھا۔میرے پاس کامنی کی بدچلنی کا کوئی ثبوت نہ تھا۔پھر کیسے جھوٹے الزام تراش کر اس کو بھری عدالت میں بدنام کرتا۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ میں بہت مایوس ہو گیا۔ پھر وکیل نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ یہ کام نہیں کر سکتے تو میں دو چار غنڈے بھیج کر اس کا جینا حرام کر دوں گا تا کہ وہ خود ہی باہمی طلاق کے لیے آمادہ ہو جائے۔یہ تجویز تو پہلی تجویز کے مقابلے میں اور بھی زیادہ واہیات تھی اس لیے میں بالکل اتفاق نہ کر سکا۔وکیل کا کہنا تھا کہ اس کارروائی کے بغیر طلاق لینے میں بہت دشواری ہوتی ہے خاص کر جب دوسری پارٹی طلاق دینا نہیں چاہتی ہو۔اس نے یہ بھی تنبیہ کی کہ آپ تب تک دوسری شادی نہیں کر سکتے جب تک طلاق منظور نہ ہوگی۔ان باتوں سے پریشان ہو کر میں نے کیس ہی واپس لے لیا۔

اس کے بعد کئی برس اور گزر گئے۔حالات میں کہیں کوئی سدھار نہیں ہوا۔پھر تنگ آ کر دوبارہ طلاق لینے کی ٹھان لی۔مگر اب عمر ایسے مقام پر پہنچ چکی تھی کہ دوسری شادی کا خیال کرنا بھی

عجیب سا لگتا تھا۔ تاہم آزادی سے جی تو سکتے تھے۔ جب شادی ہوئی تھی اس وقت کہاں معلوم تھا کہ ازدواج عمر قید ہوتی ہے جس سے رہائی پانا بہت مشکل ہے۔

یہاں آئے مجھے دو سال ہو گئے۔ چند روز پہلے ایک اچھے وکیل، راج ملہوترا، سے اچانک ملاقات ہوئی۔ پہلی بار جب اس کو دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ وہ غلط پیشے میں پھنس گیا ہے کیونکہ شکل وصورت سے وہ نہایت ہی شریف اور نیک آدمی لگ رہا تھا۔ البتہ دل میں اس بات کی تسلی ہوئی کہ وہ میرے ساتھ کوئی ہیرا پھیری نہیں کرے گا۔ میں نے سنا تھا کہ وکیلوں میں دورخا پن اور ریاکاری ہوتی ہے۔ ایک جانب اپنے موکل کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ اس کا کیس جی جان سے لڑ رہے ہیں اور دوسری جانب کیس کو مسلسل التوا میں ڈال کر فریق مخالف کی مدد کرتے ہیں تاکہ اسے پیسے کی اگاہی ہوتی رہے۔ کچھ پیشے ہوتے ہی ایسے ہیں جہاں بے ایمانی اور بددیانتی کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

اس روز راج ملہوترا سے کیس کے بارے میں سرسری گفتگو ہوئی۔ پھر دوسرے روز میں نے اس کو اپنی کیس ہسٹری کی پوری فائیل بھیج دی۔ اس نے ٹیلی فون پر مجھے اگلے سوموار کو آفس بلایا۔ مقررہ وقت پر میں راج ملہوترہ کے دفتر میں حاضر ہوا۔ اس نے گفتگو کا آغاز بڑے مہمان نواز لہجے سے کر لیا۔ ''آپ چائے پئیں گے یا کوفی؟''

''میں چائے پی کر آیا ہوں۔ آپ خواہ مخواہ تکلف کر رہے ہیں۔''

''اس میں تکلف کی کوئی بات ہی نہیں۔ یہ تو چائے کا ٹائم ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر چائے چلے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک آدمی کو چائے منگوانے کے لیے بھیج دیا۔ پھر میری فائیل کھولی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''آپ نے اپنے کیس کے بارے میں جو معلومات لکھ کر دی ہیں وہ میں پڑھ چکا ہوں۔ اور آپ کا کیس تیار کر چکا ہوں۔ کل پرسوں تک عدالت میں دائر کر لوں گا۔''

''جی بہت اچھا۔ اس میں جتنی جلدی ہوسکے اتنا اچھا ہے۔''

''اب آپ کو جلدی پڑ رہی ہے۔ جوانی کے بائیس سال یوں ہی ضائع کر لیے۔ یہ کام تو بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔''

''آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ دراصل ہماری شادی کی شروعات ہی غلط ہوگئی تھی۔ مجھے شادی کے فوراً بعد طلاق لینی چاہیے تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اپنے والدین کی باتوں میں آ گیا۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ یہ شادی بنی رہے۔ مجھے بعد میں یہ احساس ہوا کہ ایک آدمی کتنی بھی یک طرفہ کوشش کرے کہ رشتہ بنا رہے، تب تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک دوسرے فریق میں بھی اس بات کا احساس نہ جاگ اٹھے۔ کہتے ہیں نا کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔''

''ہاں کچھ بزرگوں کی عادت ہوتی ہے۔ وہ نئی نسل کی مجبوریاں نہیں سمجھتے۔ انھیں بدلے ہوئے حالات کا اندازہ نہیں ہوتا۔''

''دراصل ہر گھر کی اپنی ایک پرمپرا ہوتی ہے، کچھ سنسکار ہوتے ہیں، جن سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بچہ جنم لیتے وقت اپنے والدین سے نہ صرف حیاتیاتی اور جینیاتی ورثہ پاتا ہے بلکہ کئی ہزار سال کی ثقافتی اور تہذیبی میراث بھی حاصل کرتا ہے۔ میں نے کئی گھرانوں میں دیکھا ہے کہ آدمی عمر بھر گھٹتا رہے مگر کیا مجال کہ وہ اپنے والدین کی بات سے انکار یا احتجاج کرے۔ یہ اس کی تربیت اور سنسکار کا نتیجہ ہوتا ہے۔''

''بات تو صحیح ہے۔ ہماری سبھیتا کچھ ایسی ہے کہ ہمارے بزرگ شادی کو ایک ادارہ مانتے رہے ہیں مگر جب سے نئی روشنی آئی ہے اور کنبے ٹوٹ رہے ہیں، شادی خانہ آبادی کے معنی بدل گئے ہیں جو ہمارے بزرگ نہیں سمجھ پاتے۔''

''ہماری برادری کی پرابلم کچھ اسی نوعیت کی ہے۔ جب تک آبائی وطن میں تھے رسم و رواج، رشتے ناتے، بڑے چھوٹے، مان مریادا اور صحیح و غلط کا پاس رہتا تھا مگر جب سے ہجرت کر لی

یہ سارے قید و بند جیسے چھنا کے سے ٹوٹ گئے۔ برادری کے لوگ ٹوٹی ہوئی مالا کے دانوں کی طرح بکھر گئے۔ قیدی پرندوں کو پنجرے سے رہا کر دو تو وہ آسمانوں میں بے تحاشہ اور بے سمت اڑتے ہیں۔ اسی طرح ہم لوگ وہ ساری اڑانیں اس تھوڑے سے وقفے میں پوری کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم ماضی میں محروم رہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے "رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا۔" شاید ہمارے بارے میں ہی پیش گوئی کی تھی۔ ہماری لڑکیوں نے خود کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا ہے۔ کوئی ایم ایس ہے، کوئی ایم ٹیک ہے اور کوئی ایم بی اے۔ انھوں نے ایک نئی، وسیع اور ترقی یافتہ دنیا دیکھی ہے۔ وہ گائے کی مانند حلیم، تابع دار اور ایذا پسند عورت بننے سے انکار کرتی ہیں اور زندگی میں برابر کا درجہ مانگ رہی ہیں۔ جو لوگ ان بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا نہیں کر پاتے ہیں ان کی ازدواجی زندگی ڈانوا ڈول ہو رہی ہے۔"

"ہاں میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے کہ نقل مکانی کے بعد کشمیری پنڈتوں کے طلاق کیسز کی شرح بہت بڑھ گئی ہے۔ یہاں جموں کے فیملی کورٹ میں ہر دوسرا کیس کشمیری پنڈتوں کا ہوتا ہے۔"

"وادی میں ایسا نہیں تھا۔ بے گھری قدروں کی شکست و ریخت میں بہت بڑا رول ادا کرتی ہے۔ وہاں یہ اندیشہ رہتا تھا کہ اگر کوئی بھی غلط قدم اٹھایا تو سماج کی نظر پڑے گی، بدنامی ہوگی اور حقہ پانی بند ہو جائے گا۔ مگر ہجرت کے بعد یہ قصہ ہی ختم ہو گیا۔ نہ وہ نگہباں آنکھیں رہیں اور نہ ہی وہ چوکس سماج۔ نہ صرف شادیاں ٹوٹنے لگیں بلکہ قدروں میں بھی گراوٹ آ گئی۔ کھلے عام گھومنا پھرنا، جسمانی نمائش اور پہناوے میں انقلاب، سب کچھ گردباد کی طرح پھیل گیا۔ شناخت جب مٹ جاتی ہے تو قدریں بھی خود بخود مٹ جاتی ہیں۔"

میری نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر پڑی۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس لیے وکیل سے اجازت مانگ کر میں وہاں سے چل پڑا۔ پیچھے سے آواز آئی۔ "بھولیے گا نہیں۔ کم سے کم دو گواہوں کی

ضرورت پڑے گی۔ جب مل جائیں تو ایک بار میرے پاس لے آیئے تاکہ عدالت میں پیش ہونے سے پہلے میں ان کو کچھ ہدایات دے دوں۔"

اس کے بعد میں گواہ ڈھونڈتا رہا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس سے کہوں اور کون مان لے گا۔ دفتر میں کسی سے بات کرنا مناسب نہ تھا۔ وہ میرے ماتحت تھے اور میری عزت کرتے تھے اس لیے ان کو اپنی ذاتی زندگی کی غلاظتوں میں شامل کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ اور پھر یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ کسی سے کہوں اور وہ نا کہے یا پھر پہلو تہی کرے تو میری کوئی عزت نہیں رہے گی۔ اس لیے اس بارے میں سوچنا ہی فضول تھا۔

رہی رشتے داروں کی بات۔ ان میں سے بالراست کسی سے التماس نہیں کی البتہ سب کو اشارتاً یہ کہا کہ مجھے دو گواہوں کی ضرورت ہے۔ سوچا کہ اگر کسی کو مجھ سے ہمدردی ہو گی تو وہ رضا کارانہ طور پر خود ہی سامنے آئے گا۔ بات شروع کرنے سے پہلے لمبی چوڑی تمہید باندھ لیتا، کیس کے بارے میں ساری جانکاری دیتا اور آخر میں کہتا کہ اب کیس اس سٹیج پر پہنچا ہے کہ مجھے دو گواہ چاہئیں جو عدالت میں میری بیوی کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں۔ اس مرحلے پر سب نے سنی ان سنی کر کے منہ پھیر دیا۔ ایک قریبی رشتے دار سے بات کرنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ کسی کے پھٹے میں پاؤں نہیں دیتا۔ تاہم کہنے میں کیا ہرج تھا، زیادہ سے زیادہ 'ناں' کہہ دیتا۔ اور ہوا بھی ویسا ہی، اس نے ساری کہانی سن لی، میرے ساتھ پوری ہمدردی جتائی مگر گواہی کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی۔ پھر ایک اور رشتے دار کے پاس حاضری دی۔ اس سے بہت امیدیں وابستہ تھیں کیونکہ اسی نے مجھے عدالت میں کیس کرنے کے لیے نہ صرف اکسایا تھا بلکہ ایک جانے پہچانے وکیل سے بھی ملوایا تھا۔ بعد میں اپنی حرکت پر نظر ثانی کر کے وہ بھی مکر گیا۔ شاید اسے احساس ہوا کہ اسے اسی بہو کے خلاف گواہی دینی پڑے گی جو اس کی خاطر تواضع کیا کرتی تھی اور اگر کل کو میاں بیوی کا سمجھوتا ہو گیا تو وہ خواہ مخواہ دشمن بن جائے گا۔ اسی خود غرضی نے

اسے باز رکھا۔

جب اور کوئی رشتے دار نظر نہیں آیا تو دوستوں کی طرف رخ کر لیا۔ آبائی وطن میں ہوتا تو دوستوں کی کوئی کمی نہ تھی مگر یہاں تو چند ہی ایسے دوست تھے جو قریبی کہلانے کے لائق تو نہ تھے مگر فہرست میں شامل تھے۔ منوہر لال کے ساتھ میرے بہت پرانے مراسم تھے۔ جا کر اسے گھر پر ملا اور اپنی پرابلم سے آگاہ کیا۔ پھر اس سے براہ راست التجا کی: ''یار میری خواہش ہے کہ تم میری جانب سے عدالت میں شہادت دو۔ وہاں تمھیں زیادہ کچھ نہیں بولنا پڑے گا۔ بس میری ازدواجی زندگی سے متعلق دو تین سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔ چونکہ تم میری ذاتی زندگی سے بخوبی واقف ہو اس لیے تمھیں یہ کام کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

منوہر لال کچھ دیر کے لیے چپ رہا اور پھر بول اٹھا۔ ''اس بارے میں مجھے سوچنا پڑے گا ۔میں کل تک تمھیں جواب دوں گا۔''

اس وقت منوہر لال کا جواب نہ دینا انکار کے برابر تھا۔ دونوں کو احساس تھا کہ وہ کل کبھی نہیں آئے گا۔ میں زیادہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چل پڑا۔

نراش ہو کر میں وکیل سے ملنے چلا گیا۔ وہ میرا انتظار کر رہا تھا کیونکہ کیس عدالت میں داخل کر دیا گیا تھا اور اب اس کی پیشی لگنے والی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں ان دونوں گواہوں کی ضرورت پڑتی۔ وکیل نے سب سے پہلے یہی پوچھا کہ گواہوں کا انتظام ہوا یا نہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا اور ساتھ ہی کہا کہ اگر گواہوں کے بغیر کوئی اڑچن آتی ہے تو کیس واپس لے لیں۔ لاچاری کے سبب میں پوری طرح ناامید ہو چکا تھا۔ مگر وکیل صاحب نے ہمت بندھائی اور کہنے لگے۔ ''آپ اس بات کی فکر نہ کیجیے۔ آپ کو گواہ نہ ملے، مجھے تو مل جائیں گے۔ گواہوں کا کیا ہے عدالت کے باہر کتنے انتظار کرتے رہتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔''

''گواہ تلاشے نہیں جاتے بلکہ خریدے جاتے ہیں۔تھوڑا اور روپیہ خرچ کرنا پڑے گا۔''

''آپ کا مطلب کہ گواہ بکاؤ ہوتے ہیں۔''

''جی ہاں، زندگی کا ہر شعبہ بکاؤ ہے۔انتظامیہ...قانون سازیہ...عدلیہ...!سب کچھ۔
مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے نئی آشا کی کرن دکھائی ہو۔میں نے پوچھا۔''وہ کیسے؟''

''ارے صاحب یہ کورٹ کچہری ہے۔یہاں تو ایسی گواہیاں ہر روز دی جاتی ہیں۔آپ چنتا نہ کریں۔میں دو پیشہ ور گواہوں سے بات کرلوں گا۔یہ تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔وہ تو فوجداری مقدموں میں گواہیاں دیتے ہیں، دیوانی مقدموں کی تو بات ہی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔آپ جو مناسب سمجھیں، کرلیجیے۔''

''ہر ایک گواہ کو پانچ ہزار روپے دینے پڑیں گے۔''

میری جان میں جان آئی۔میں تو سوچ رہا تھا کہ نہ جانے چالیس پچاس ہزار کا چونا لگ جائے گا۔تاہم میں نے خوشی کا اظہار نہیں کیا اور رسماً بول اٹھا۔''ہوسکے تو اس سے کم کروانے کی کوشش کرلیجیے۔آپ کو معلوم ہی ہے کہ میری کوئی بالائی آمدنی نہیں ہے۔سب کچھ تنخواہ پر ہی نربھر ہے۔''

''آپ فکر مت کیجیے، مجھ سے جتنا ہوسکے گا، کم کرادوں گا۔''

اور میں وہاں سے نچنت ہوکر واپس چلا آیا۔

مہینے بھر کے بعد دونوں گواہوں کو کورٹ میں پیش کیا گیا۔میں بھی وہیں پر موجود تھا۔ان سے میری نجی زندگی کے بارے میں کئی سوالات پوچھے گئے جن کے بارے میں انھیں پہلے سے جانکاری مہیا کی گئی تھی۔انھوں نے بلا روک ٹوک جواب دے دیے اور اس طرح دونوں کی گواہی ریکارڈ کرلی گئی۔

اس کے بعد بھی مجھے کئی بار عدالت میں پیش ہونا پڑا۔میری بیوی ہندستان چھوڑ کر دبئی

چلی گئی تھی۔ عدالت کا نوٹس اس کے پچھلے ایڈریس پر دو تین بار بھیج دیا گیا مگر وہ عدالت میں پیش نہیں ہوئی۔

انجام کار کیس یک طرفہ سنا گیا اور میرے حق میں فیصلہ صادر ہوا۔ اور وہ بھی ان دو گواہوں کی گواہی پر جنھوں نے مجھے اس روز سے پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔

☆☆☆☆☆

موت کا کنواں

پتاجی نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ رکھا تھا تا کہ میں کہیں اِدھر اُدھر نہ چلا جاؤں اور بھیڑ میں گُم ہو جاؤں۔ میرے ساتھ میری ماں اور بڑی بہن بھی تھی جو عمر میں مجھ سے آٹھ سال بڑی تھی۔ اتوار ہونے کے سبب گورنمنٹ سنٹرل مارکیٹ میں، جس کو 'نمائش گاہ' یا 'نمائش' بھی کہتے ہیں، لوگوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ ایک تو اتوار کی چھٹی تھی اور اس پر انتظامیہ نے 'نارء ووٹھ' (آتشی چھلانگ) کا اہتمام کیا تھا۔

انسانی فطرت عجیب سی ہے۔ اس کی ایذا پسند جبلت اپنے ہی ہم جنس کو زندگی جوکھم میں ڈالتے دیکھ کر محظوظ ہوتی ہے اور اسے تماشہ کہا جاتا ہے۔ خود کہیں معمولی سی خراش بھی لگ جائے تو تلملا اُٹھتا ہے۔ خیر یہ تو صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ ماضی میں کئی ملکوں کے مبارز آپسی جھگڑوں کا فیصلہ 'ڈوئیل' کے ذریعے طے کرتے تھے اور ناظرین لطف اندوز ہوتے تھے۔ اٹلی کے شہر روم میں بنے سب سے بڑے ایمفی تھیئٹر، کولوسیم، میں پیشہ ور تیغ زنوں اور وحشی جانوروں کے باہمی مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا تھا جس کو دیکھ کر بادشاہ، روٴسا اور دیگر تماشائی محظوظ ہوتے تھے۔ شاید لشکر کشی بھی اسی بہیمیت کا نتیجہ رہی ہو۔ اب موجودہ زمانے میں بھی وہی جبلت کارفرما ہے۔ نمائش گاہ میں اکٹھی ہوئی یہ بھیڑ ایک غریب آدمی کو موت کے کنویں میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھنے کی متمنی تھی چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ سنٹرل مارکیٹ میں والد کی لکڑی کے سامان اور پیپر ماشی کی دُکان تھی۔ نمائش کے دوران وہ صبح سویرے دکان پر چلے جاتے اور رات دیر گئے واپس آتے۔

نمائش گاہ کے تین حصے تھے۔ پہلے میں مستقل دُکانیں تھیں جہاں کشمیر میں پیدا ہونے والی چیزیں، صنعتی اشیا اور دستکاریاں فروخت ہوتی تھیں ۔ یہ دکانیں سال بھر کھلی رہتی تھیں کیونکہ سیاح خریداری کے لیے یہاں چلے آتے تھے۔ دوسرے حصے میں ایک دومہینوں کے لیے عارضی دُکانیں کھُل جاتی تھیں جن دنوں نمائش کا اہتمام ہوتا تھا۔ ان دکانوں میں دوسری ریاستوں سے آئے ہوئے تاجر ایسی چیزیں دستیاب کرتے تھے جو عام طور پر مقامی بازاروں میں نہیں ملتی تھیں۔ تیسرا حصہ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے لیے مخصوص تھا جہاں سرکار کی طرف سے سال بھر کیے گئے اقدامات کو درشایا جاتا تھا۔ گذشتہ سال میں بجلی، پانی، سڑک، تعلیم، جنگلات، ریشمی صنعت، حفظان صحت اور منصوبہ بندی وغیرہ کے میدانوں میں سرکاری حصولیابیوں کا لیکھا جوکھا لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ کچھ ثانیوں کے لیے لوگ یہ بھول جاتے تھے کہ موسم سرما میں ان کے گھروں میں اندھیرا رہتا ہے، پارے کی گراوٹ اور پانی کی کمی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور بازاروں سے اشیائے خوردنی، ایندھن اور مٹی کا تیل غائب ہو جاتے ہیں۔

نمائش گاہ کے درمیانی حصے میں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مضبوط ایلومینیم کی سیڑھی عموداً کھڑی رہتی تھی جس کو اسٹیل کی موٹی تاروں سے زمین میں اس طرح پیوست کیا گیا تھا کہ تندوتیز ہوائیں بھی اس کو ہلا نہیں پاتی تھیں۔ سیڑھی کے آخری پائیدان پر ایک بڑا سا تختہ جڑا ہوا تھا جس پر ایک آدمی بمشکل کھڑا رہ سکتا تھا۔ وہاں پر پہلے ہی سے پٹرول کا ایک کھلے منہ والا کنستر اور ایک سونٹا، جس کے ایک سرے پر کپڑا لپیٹا گیا تھا، رکھا جا چکا تھا تاکہ مشعل کا کام دے سکے۔ زمین سے اس تختے پر نظر ڈالتے ہی سارے بدن میں کپکپی پھیل جاتی تھی۔

پاپا نے کھڑے رہنے کے لیے ایک اچھی سی جگہ ڈھونڈ لی تھی جہاں سے ہم ساری کارروائی بڑی آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں تھا تو بہت چھوٹا مگر اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ بڑوں کی باتیں سمجھ نہ آتیں۔ زیادہ تر لوگ چھلانگیے کی ہمت اور حوصلے

کی داد دے رہے تھے اور دبی آواز میں دعا کر رہے تھے کہ سارا معاملہ بخیر انجام پائے۔ سب کو یہ احساس تھا کہ کام بہت جوکھم کا ہے اور تھوڑی سی چوک بھی اس کی جان لے سکتی ہے۔ بغل میں کھڑا ایک جوان کسی بزرگ سے کہنے لگا۔

''آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہوگا کہ اگر جسم پر آگ لگا کر ناگاہ ہوا بہت تیز ہو گئی تو آگ پر قابو پانا مشکل ہوگا۔ آدمی جل سکتا ہے یا پھر اس کا دم گھٹ سکتا ہے۔ سنا ہے کہ ماضی میں ایک بار ایسا ہوا تھا۔''

''میں نے بھی کچھ ایسا ہی سنا ہے۔'' بزرگ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

کوئی تیسرا آدمی بیچ میں بول پڑا۔ ''سچ کہہ رہے ہیں بھائی صاحب۔ یہ بہت ہی جوکھم کا کام ہے۔ اگر کودتے سمئے چھلانگیے کی سمت میں کچھ ہیر پھیر ہو گئی تو خدا ہی حافظ ہے۔ چاروں طرف تاروں کا جال ہے۔''

''یہ بھی ممکن ہے کہ تیز ہوا کے دباؤ کے ساتھ کہیں بہہ گیا تو دائیں بائیں تاروں کے جال میں الجھ جائے گا اور پھر بے قابو ہو کر پانی کی بجائے زمین پر گر سکتا ہے۔ اس طرح زبردست چوٹ لگ سکتی ہے۔ اور پھر جان کے لالے بھی پڑ سکتے ہیں۔'' پہلا آدمی دوبارہ بول اُٹھا۔

''بھائی، اس کی سمت کی رہنمائی کرنے کے لیے ہی تو نیچے کنویں میں پٹرول ڈال کر آگ لگائی جاتی ہے تاکہ وہ اِدھر اُدھر نہ بھٹکے۔ پھر بھی خدا مالک ہے۔'' دوسرے نے اپنی رائے دی۔

یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا جب تک اصل کارروائی شروع نہ ہوئی۔ اِدھر ممی لوگوں کی باتیں سن کر بہت ڈر گئی۔ اس کے اندر ممتا جاگ اٹھی۔ وہ پتا جی سے کہنے لگی۔ ''اگر میری بات مان لیں تو یہاں سے چل دیں۔ مجھے یہ موت کی چھلانگ دیکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ خدانخواستہ اگر کچھ ہو گیا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔''

پتا جی کو اس کی پریشانی کا اندازہ ہو گیا۔ انھوں نے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہر اتوار کو یہ تماشہ ہوتا ہے۔ میں نے کئی بار خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کبھی کوئی مشکل نہیں آئی۔ تم اطمینان رکھو۔''

مگر ممی کا اضطراب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آخر عورت جو تھی۔ عورت کا دل بہت ہی نرم ہوتا ہے۔ اسے دوسرے کی مصیبت دیکھی نہیں جاتی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ اپنے شوہر کے قریب تر آتی گئی۔ پہلے اس کی بانہہ پکڑ لی اور پھر اس کے بدن کے ساتھ مانو چمٹ سی گئی۔ ہم بچے سمٹ کر والدین کی بغل میں کھڑے رہے۔

''پاپا، انسان کی سادیت پسندی اس کے ذہن پر کیوں غالب آتی ہے؟'' دیدی نے پاپا سے سوال کیا۔

''ایسا نہیں ہے۔ ہاں کبھی کبھار انسان یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔''

''میں آپ سے اتفاق نہیں کرتی۔ دراصل انسان کی جبلت ہی میں سفلہ پن ہے۔ ہر دور میں انسان دوسروں کو تہ تیغ کرنے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ محض ایک عورت کی خاطر ہزاروں لاکھوں لوگوں کا خون بہاتا رہا۔ چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے کے لیے سارے خطے کو لال کرتا رہا۔ خدا کا حکم بجا لانے کے لیے شمشیروں کو آبدار کرتا رہا جیسے خدا اپنا حکم منوانے کے قابل نہ ہو۔ دراصل انسان بذاتہ اپنی حیوانی وراثت کو بھلا نہیں پاتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان بارہا تفریحاً ایذا رسانی پر آمادہ ہوا ہے۔''

ممی کو من ہی من میں حیرت ہو رہی تھی کہ اس کی بیٹی کتنی بڑی بڑی اور سیانی باتیں کرنے لگی ہے۔ وہ خود نہ جانے کن خیالوں میں کھو گئی تھی۔ اس کو اپنی زندگی کے وہ دن یاد آ رہے تھے جب اس نے پاپا سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پاپا زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ بس میٹرک پاس تھے ۔شکر تھا کہ وراثت میں انھیں دو دکانیں مل گئیں جن سے وہ مستقبل میں اپنی روزی روٹی کا

بندوبست کر پائے ورنہ نہ جانے کیسے دن دیکھنے پڑتے۔ممی خود تعلیم یافتہ تھی۔ایم اے پاس کیا تھا۔ کالج کے دنوں ہی میں پاپا کے ساتھ عشق کر بیٹھی تھی۔ نانا جی سرکاری افسر تھے۔انھوں نے بہت سمجھایا بجھایا مگر ممی نے قدم پیچھے ہٹانے سے صاف انکار کیا۔ رشتے داروں نے بھی سمجھایا کہ تم اندھے کنویں میں کود رہی ہو۔تم دونوں کا کوئی میچ نہیں ہے۔اب بھی وقت ہے، چھوڑ دو اور نئی زندگی شروع کرو۔کھاتے پیتے گھرانوں کے کئی تعلیم یافتہ لڑکے مل جائیں گے۔بس ہاں کرنے کی دیر ہے۔مگر وہ نہ مانی۔اور اس طرح والدین شادی کرنے پر مجبور ہو گئے۔آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس روز اس نے بھی طعنوں اور جھڑکیوں کے درمیان موت کے کنویں میں چھلانگ لگائی تھی۔ سہیلیاں ڈاکٹروں اور انجینئروں سے بیاہی گئیں جبکہ وہ اپنے آپ کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اپنے پنڈت سماج کو کوستی رہتی جس میں صرف پڑھے لکھے اور اچھے عہدے پر کام کرنے والوں کو ہی عزت دار سمجھا جاتا ہے۔ممی بہت دیر تک انھی خیالوں میں کھوئی رہی اور اسے آس پاس کی کوئی خبر نہ رہی۔ وہ صرف اس آگ کے کنویں کے بارے میں سوچ رہی تھی جس میں وہ بہت عرصہ پہلے کود چکی تھی۔

کچھ وقفے کے بعد ایک ٹھگنا سا آدمی، سر سے پیر تک موٹے سفید کپڑے کی پٹیاں باندھے، کنویں کے دوسرے کنارے پر پھرتی سے چلتے ہوئے دکھائی دیا جیسے ابھی ابھی کسی ہسپتال سے مرہم پٹی لگا کر نکلا ہو۔البتہ چہرہ اور ہاتھ کھلے چھوڑ رکھے تھے تاکہ زینہ چڑھنے، سانس لینے اور دیکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔لوگوں نے دیکھتے ہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اس کا استقبال کیا۔

چھلانگیا آہستہ آہستہ دونوں ہاتھوں سے سیڑھی کو تھامے اوپر کی جانب قدم بڑھاتا چلا گیا۔یکایک لوگوں میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے دل کی دھڑکنیں بند ہو گئی ہیں۔ سبھی لوگ اپنی سانسیں روکے اس کی نقل و حرکت کو مسلسل دیکھ رہے تھے۔مگر وہ دلیری سے ایک ایک پائیدان سر کرتا ہوا آخری پائیدان پر پہنچ گیا جہاں اس کے کھڑے ہونے کے لیے

ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا۔ لمحہ بھر رک کر اور گہری سانس لے کر وہ اس تختے پر جا کھڑا ہوا جہاں سے اس کو کودنا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ ہلا کر تماشائیوں کا خیر مقدم کیا۔ پھر مشعل کو پٹرول کے کنستر میں ڈبو کر باقی پٹرول اپنے اوپر چھڑک لیا۔ اس کے بعد ماچس سے مشعل جلائی اور جلدی سے دستانے اور ٹوپی پہن لی۔ ٹھیک اسی وقت نیچے کسی شخص نے کنویں میں پٹرول ڈال کر اسے آگ لگا دی۔ چھلانگیے نے اشارہ پا کر دفعتاً پٹرول چھڑکے بدن کو آگ دکھا دی۔

مبہوت لوگ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ایک انسان اوپر سیڑھی کے آخری پائیدان پر شعلہ بار ہو چکا تھا۔ وہ من ہی من میں دعائیں کر رہے تھے کہ سب کچھ سلامتی سے انجام پذیر ہو جائے۔ کنویں کی آگ سے سمت کا اندازہ لگا کر چھلانگیا کنویں کی جانب کود پڑا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آسماں سے کوئی آگ کا گولا گر کر کنویں کی جانب آ رہا ہو۔ کنویں کے ارد گرد کئی مددگار چوکس کھڑے تھے۔ جونہی چھلانگیا کنویں میں گر پڑا انھوں نے فوراً اسے باہر نکالا۔ پانی میں گرنے کے سبب اس کے بدن کا شعلہ بجھ چکا تھا۔ کنویں سے نمودار ہوتے ہی پٹیوں میں بندھا وہ چھلانگیا نہ جانے کہاں اوجھل ہو گیا۔

تماشائیوں میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی جس کا اظہار انھوں نے تالیوں سے کیا۔ اس کے بعد مجمع میں ہلچل سی مچ گئی۔ سبھی لوگ واپس گھر جانے کے لیے صدر گیٹ کی طرف دوڑ پڑے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہم بھی گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ممی نے راستے میں ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ بس سوچتی رہ گئی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے اپنے خاوند سے سوال کیا۔ ”کیا اس چھلانگیے کے بال بچے بھی ہیں؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ یہ کشمیر کا باشندہ نہیں ہے۔ باہر سے آیا ہے۔ اس کی فیملی اس کے آبائی شہر میں رہتی ہے۔ یہ سب جوکھم وہ ان کا پیٹ پالنے کے لیے ہی اٹھاتا ہے۔“

”کیا اس کے بچوں کو معلوم ہوگا کہ ان کا باپ کس طرح روزی روٹی کمانے کے لیے اپنی

زندگی داؤ پر لگاتا ہے؟"

"بھگوان جانے۔ کم سے کم بیوی کو معلوم ہوگا۔ اُس کو تو بتایا ہوگا۔"

"وہ اسے منع نہیں کرتی؟ اسے یہ تو معلوم ہوگا کہ یہ کھیل کتنا جوکھم بھرا ہے۔"

"معلوم تو ہوگا ہی مگر وہ بے چاری مجبور ہے۔ عیال کا پیٹ تو کسی طرح پالنا ہی ہے۔ وہ کیسے روک سکتی ہے۔ پھر ایک یہ چھلانگیا ہی تو نہیں ہے جو جوکھم بھرے کام کرتا ہے۔ پیٹ کی آگ انسان سے کیا کچھ نہیں کراتی۔"

اس رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔ آج اتنے برسوں بعد جب بھی میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو رواں رواں کھڑا ہو جاتا ہے۔ مجھے تو ساری دنیا موت کا کنواں نظر آتی ہے جس میں ہم بار بار کودتے اور ابھرتے رہتے ہیں۔

پرت در پرت لوگ

ماں کالاڈلا تھاوہ۔نام تھاشمشیر سنگھ۔فطرت البتہ ایسی تھی کہ کہیں شمشیر دکھائی دے رہی تھی نہ شمشیر کا جوہر۔اس کو دیکھ کر ہر کوئی حیران ہوتا کیونکہ سردار نام سن کر ذہن میں ایک نڈر، بے خوف اور گبرو نوجوان کی شکل وصورت ابھرتی تھی مگر اس میں ایسا کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔شمشیر سنگھ والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ بھی منتیں مانگ مانگ کر پیدا ہوا تھا۔تین اور بہنیں تھیں، تینوں اس سے بڑی لیکن دو ہی بیاہی جا چکی تھیں۔تیسری کے لیے ابھی تک کوئی معقول بَر ملا نہیں ملا تھا۔

اکلوتا بیٹا اور موتی دونوں حفاظت سے پلتے ہیں چاہے شکم کے اندر ہوں یا شکم کے باہر۔

دو سال پہلے شمشیر سنگھ ملازمت کی خاطر لکھنؤ سے دہلی چلا آیا تھا۔تعلیم لکھنؤ ہی میں مکمل کی تھی۔ایم اے، ایم فل کی ڈگری ملتے ہی دہلی سے نوکری کا آفر ملا تھا۔پتا جی ستنام سنگھ سنار کا کام کرتے تھے۔اچھی خاصی کمائی ہوتی تھی۔وہ انگریزی میں کہتے ہیں نا کہ بچپن میں سونے کے چمچ سے دودھ پیتا تھا، شمشیر پر صادق آتا ہے۔ستنام سنگھ نے بہت کوشش کی کہ بیٹا اس کے ساتھ ہی کام میں لگ جائے اور اس کا ہاتھ بٹائے۔بھگوان کا دیا بہت کچھ تھا۔رہنے کے لیے اچھی کالونی میں ایک بڑا سا مکان، موٹر کار اور زندگی کی دوسری آسائشیں۔ستنام سنگھ کو کیا معلوم تھا کہ بیٹے کو تعلیم دلوا کر وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔شمشیر کو بہت اچھے پبلک سکول میں بھیج دیا گیا، پھر کالج اور اس کے بعد یونیورسٹی۔ہر جگہ شمشیر امتیازی نمبرات لے کر کامیاب ہوتا رہا۔بھلا جس لڑکے نے اتنی ساری ڈگریاں حاصل کرلی ہوں وہ اب کہاں کٹھالی کرتا پھرے۔

قسمت نے بھی یاوری کی کہ پہلے ہی انٹرویو میں دہلی کے ایک کالج نے اسے نوکری کا

آفر دے دیا۔ گھر والوں نے بہت منع کیا مگر وہ مانا۔ اس نے اپنے لیے کچھ انوکھے سپنے سنجوئے تھے۔ اکیلا تھا، سولاچپت نگر میں دو کمرے کا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ گو مکان مالک بھی سردار ہی تھا مگر دونوں کے درمیان زیادہ تعامل نہیں رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شمشیر کم گو تھا اور صرف وقت ضرورت مکان مالک یا اس کی فیملی سے بات کر لیتا۔ آنے جانے کے راستے بھی الگ تھے اور مکان مالک کی کہیں کوئی مداخلت نہیں تھی۔

شمشیر تھا بھی بہت پیارا سا لڑکا۔ کالج اور یونیورسٹی کے دنوں میں کئی لڑکیاں اس پر مرمٹتی تھیں۔ طرح طرح کے بہانے بنا کر اسے بات کرنے کی کوشش کرتیں مگر دل میں یہی ڈر رہتا تھا کہ کہیں وہ خفا نہ ہو جائے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ اس لیے موقعے کی تلاش میں وقت گنواتی رہ گئیں۔ ڈاڑھی پگڑی ہونے کے باوجود غیر سکھ لڑکیاں بھی اس پر فدا ہوتی تھیں لیکن وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ اپنی دھن میں مست چلا جاتا۔ اس کی ساری قوت اپنی تعلیم پر مرتکز تھی اور اس بارے میں وہ کوئی سمجھوتا کرنے کو تیار نہ تھا۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔ راستے ناپنا، نظر بازی، عشق مٹکا ــ یہ سب اس کی ڈکشنری سے باہر تھے۔ یہاں تک کہ تفریح اور سینما سے بھی وہ پرہیز کرتا تھا۔ دوست اس کو 'ماماز بوائے' کہا کرتے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ ماں کے سائے تلے جینا پسند کرتا تھا۔

ابھی چھ سات مہینے بھی نہ ہوئے کہ بس سٹینڈ پر ایک خوبصورت لڑکی کی نظر اس پر پڑی۔ وہ صبح شام اس کا تعاقب کرتی رہی اور آخر کار ایک روز ریگل ریستوران میں پکڑ ہی لیا۔ شمشیر دفتر سے فارغ ہو کر یہاں آیا تھا اور اکیلا کرسی پر بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ نونیت کور نے اس کے بارے میں پہلے ہی سے سب معلومات حاصل کر لی تھیں کہ وہ غیر شادی شدہ ہے، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، گھر میں ایک ہی بہن بچی ہے اور بوڑھے والدین کافی مالدار ہیں۔ نونیت کئی دنوں سے اس کا سایہ بن کر پیچھا کر رہی تھی۔ اس نے یہ بھی معلوم کیا تھا کہ شمشیر کو سادہ لباس اور کم میک

اَپ والی لڑکیاں پسند ہیں۔ اس لیے آج وہ پوری تیاری کر کے اس کے پاس آئی اور آتے ہی کہنے لگی۔ ''ہائے۔ آپ شمشیر ہیں۔''

''جی ہاں، میں شمشیر ہوں۔ آپ کون؟''

''میرا نام نونیت کور ہے۔ یہیں ایک فائنانشل کمپنی میں ڈائریکٹر ہوں۔ یونو، مائی کمپنی از ڈیلنگ وِدھ ہائیر پرچیز اور ٹیک فارسٹری۔ بہت منافع ہے اس لائن میں۔''

''ٹیک فارسٹ.....! تین سال میں دو گنا روپیہ...! یہی نا؟ مجھے بھی تو نہیں اپنے جال میں پھنسانے آئی ہیں۔ آئی ہیونو اِنٹرسٹ ان آل دِس۔''

''اوہ کم آن، آپ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ میں کمپنی کی سیلز گرل نہیں ہوں۔ ہیواے ہارٹ!''

''اچھا کہیے، پھر کیسے آنا ہوا۔ مجھ سے کوئی کام ہے کیا؟''

''نہیں یوں ہی۔ دراصل لکھنؤ میں میری ایک سہیلی آپ کے کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ ہمیشہ آپ کی تعریفوں کے پُل باندھا کرتی تھی۔ تب سے مجھے آپ کو دیکھنے کا شوق چرایا۔ وہ آج کل دہلی آئی ہوئی ہے اور ابھی میرے ساتھ ہی تھی۔ اتفاقاً آپ کو دیکھ کر اچھل پڑی۔ میں نے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر وہ شرم کے مارے بھاگ گئی۔ بیٹھنے کو نہیں کہیں گے کیا؟''

''اوہ باتوں باتوں میں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ بیٹھیے، اس میں تکلف کرنے کی کیا بات ہے۔''

وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور بیرے کو بلا کر کافی کا آرڈر دے دیا۔ اس کے بعد دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ کالج لائف کی، کچھ فلموں کی، کچھ فیشن پرستی کی اور کچھ پرانے اقدار و روایات کی۔ وہ قدیم ہندستانی تہذیب اور رسم و رواج کی تعریف کرنے لگی اور ایسا ظاہر کرتی رہی کہ وہ خوش اخلاقی اور فرمابرداری کو ترجیح دیتی ہے۔ گفتگو اتنی لمبی کھنچ گئی کہ دوسرے کپ کی باری

آ گئی اور اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہہ کر اپنی اپنی راہ پکڑ لی۔ نونیت کا یہ داؤ صحیح نشانے پر لگ گیا۔ وہ رات بھر صرف شمشیر کے بارے میں سوچتی رہی۔

اُدھر شمشیر کو بھی نونیت کا ساتھ اچھا لگا۔ پہلی دفعہ اس نے کسی غیر لڑکی کے ساتھ اس طرح کھل کر باتیں کی تھیں۔ اس سے پہلے وہ صرف ماں کی گود میں سر رکھ کر اپنا دل کھول کر رکھ دیتا تھا۔ وہ اپنی ماں کو بہت چاہتا تھا۔ شمشیر رات بھر یہی سوچتا رہا کہ نونیت سے پھر کب ملاقات ہوگی۔ مگر نونیت تو بڑی گھاگ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شمشیر کے دل میں نیزہ چبھ گیا ہے اب کچھ دن اس کی کسک کا مزہ لیتا رہے تو تڑپ میں شدت پیدا ہوگی۔ اس کے برعکس شمشیر ہر شام اسی ریستوران میں یہ سوچ کر حاضری دیتا رہا کہ شاید وہ درد کا اندازہ لگا کر چلی آئے۔

دو تین روز کی غیر حاضری کے بعد نونیت پھر اچانک ریستوران کے سامنے دروازے پر نمودار ہوئی اور شمشیر کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ دیکھتے ہی شمشیر سے کہنے لگی۔ ''ہائے شمی، کیسے ہو؟ سوری، دو تین دن نہیں آسکی۔ دراصل میری ماں آئی ہوئی تھی وہ چھوڑ ہی نہیں رہی تھی۔ ورنہ بہت من کر رہا تھا آنے کے لیے۔ آپ سے اس روز باتیں کیا کرلیں روز آپ کی باتیں سننے کو جی کرتا تھا۔ اس سے پہلے میں کسی کی گفتگو سے اتنی محظوظ نہیں ہوئی ہوں۔ سچ پوچھیے تو مجھے آپ کی گفتگو کا انٹلکچول کنٹینٹ بہت اچھا لگا۔ بہت کچھ سیکھنے کو مل گیا۔''

''اوہ آئی سی۔ چلو اچھا ہوا، آتو گئی۔'' اس نے لمبا سانس کھینچ کر کہا۔

''آپ بھی میرا انتظار کر رہے تھے کیا؟''

''ہاں بھی اور نہیں بھی۔ ہاں اس لیے کہ آپ کی کمپنی اچھی لگی اور ناں اس لیے کہ مجھے عورتوں سے زیادہ رغبت نہیں ہے۔''

''کم آن، رغبت تو تب ہوگی جب ان کے ساتھ اٹھیں گے بیٹھیں گے۔ ایوائیڈ کریں گے تو ان کو کیسے سمجھ سکیں گے۔ آپ تو بہت شرمیلے ہیں۔ عورت کہیں آپ کو کھا تھوڑے ہی

جائے گی۔ آپ اتنے شریف اور خوبصورت ہیں کہ کوئی بھی عورت آپ پر فریفتہ ہوگی۔ میں تو آپ کو دیکھ کر ہی بے قابو ہوگئی۔"

اس کے بعد ان کی ملاقاتیں روزانہ ہوتی رہیں۔ کبھی کافی، کبھی لنچ اور کبھی ڈنر۔ اب شمشیر نونیت کے فلیٹ پر بھی جانے لگا تھا۔ ایک پوش سوسائٹی میں خوبصورت فلیٹ میں رہتی تھی۔ پہلے دن شمشیر کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ بس کبھی دائیں دیکھتا رہا اور کبھی بائیں۔ اور وہ اس کے تجسس کو بھانپ چکی تھی۔

دراصل یہ فلیٹ نونیت کا اپنا نہیں تھا بلکہ کرائے پر لیا گیا تھا۔ پوش کالونی میں ایسا فلیٹ قسمت والوں کے پاس ہی ہوتا ہے۔ فلیٹ کے اندر کی تزئین، کمروں کی سجاوٹ اور پھر باتھ روم اور کچن کا سامان دیکھ کر آدمی حیران ہو جاتا تھا۔ اس کے رہنے کے اسٹائل سے شمشیر کافی متاثر ہوا۔ وہ باضابطہ طور پر نونیت سے ملنے آتا، دکھ سکھ کی باتیں کرتا اور چھٹی کے دن نونیت کے سنگ ہی گزارتا۔ پہلے بیئر سے شروعات ہوئی پھر دھیرے دھیرے وہسکی منہ کو لگ گئی۔ کئی بار پارٹیوں کا انعقاد ہوتا رہا جن میں اکثر وہ دوست نظر آتے تھے جو خود کو نونیت کی کمپنی کے ڈائریکٹر کہتے۔ ان کے ساتھ ان کی گرل فرینڈس بھی ہوتی تھیں۔ میزبان ہمیشہ نونیت ہوتی جس کا حسن انتظام دیکھ کر شمشیر بہت خوش ہو جاتا۔ دیر رات جب سب واپس چلے جاتے تو نونیت شمشیر کی بانہوں میں جھولتی رہتی۔

پانچ چھ مہینے یوں ہی گزر گئے۔ پھر ایک رات نونیت نے بڑی سنجیدگی سے شمشیر کو کہا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ شمشیر کا سر چکرا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچتا ہی رہ گیا کہ نونیت نے اس کا مداوا بھی خود ہی ڈھونڈ نکالا۔ کہنے لگی۔ "تم لکھنؤ اپنی ممی کے پاس جاؤ اور اس کو یہ خبر دے دو۔ کوشش کرو کہ ہم دونوں کی شادی ایک دو مہینے ہی میں ہو جائے ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ مجھے ماں جی پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ تمھاری کوئی بات نہیں ٹالیں گی۔

چونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے منگنی اور انگوٹھی کی رسم شادی کے ایک دن پہلے پوری کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''میں کل ہی چلا جاتا ہوں۔'' شمشیر نے جواب دیا۔

دو چار دن میں ہی وہ نہ صرف اپنے والدین کو منا کر آ گیا بلکہ شادی کی تاریخ بھی طے کر کے آ گیا۔ شادی لکھنؤ میں طے ہوئی اور میریج ہال کا ارینجمنٹ شمشیر کے پتا جی نے کر لیا۔ چونکہ اکلوتا بیٹا تھا اس لیے روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ لڑکی والوں نے وہیں پر ہفتے بھر کے لیے کرائے پر ایک فلیٹ لے لیا۔

شادی کے بعد نونیت صرف ہفتے بھر سسرال میں رہی۔ سبھی لوگ اس سے بہت خوش تھے ۔خوش گفتار، خوش سلیقہ اور خوش نما۔ ساس کو بیٹے سے کوئی شکایت نہ رہی اور نہ ہی سسر کو۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ اس نے والدین کی مرضی کے بغیر شادی کر لی تھی۔ دہلی پہنچتے ہی نونیت نے اپنے سارے گہنے، جو اس کو میکے اور سسرال سے ملے تھے، بنک لاکر میں رکھ دیے۔ تحائف اور نقدی بھی لے کر آ گئی تھی۔

چند مہینے اور گزر گئے۔ گھر میں نونیت کے دوست آنے لگے۔ کچھ دیکھے بھالے تھے اور کچھ ان دیکھے۔ نونیت ان کے ساتھ بہت ہی بے تکلف ہوتی جا رہی تھی جو شمشیر کو پسند نہیں تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ایک دو بار تو ٹوک دیا مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔ ایک روز نونیت نے صاف صاف کہہ دیا، ''یہ میرے دوست ہیں، میں انھیں نہیں چھوڑ سکتی، تمھیں جو کرنا ہے کر لو۔''

کہتے ہیں سیانا کوا گوہ کھاتا ہے۔ نونیت کے اس رویے سے شمشیر سنگھ کا پارہ بلند ہو گیا۔ شریف تھا تو کیا ہوا۔ آخر سردار کا بیٹا تھا۔ غصے میں آ کر اس نے نونیت پر دو چار جھاپڑ جھڑ دیے۔ نونیت اسی گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ گالی گلوچ پر اتر آئی۔ جتنی اس کی زبان دراز ہو رہی تھی اتنا

شمشیر کا ہاتھ اٹھ رہا تھا۔ آخر کار نونیت نے اپنے بال بکھرا کر اور اپنا بلاؤز پھاڑ کر پولیس تھانے میں شکایت درج کروالی۔ خود الگ رہنے لگی۔ معاملہ عدالت میں پہنچ گیا اور شمشیر پر جہیز مانگنے کا کیس درج ہو گیا۔

اُدھر نونیت کے دوست شمشیر کو ٹیلی فون پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دے کر پریشان کر رہے تھے۔ اِدھر شمشیر کی ماں حد سے زیادہ تڑپ رہی تھی۔ شادی کا خرچہ، بہو کے زیور، جو کچھ تھا وہ تو چلا گیا، اب اس کے بیٹے کو جان کے لالے پڑ رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں شریف ہونا بہت بڑی معذوری ہے۔ زندگی کے ہر شعبے پر لچے لفنگوں کا راج مسلط ہے۔ شمشیر اور اس کے والدین جس دلدل میں پھنس چکے تھے اس میں سے نکل پانے کی کوئی ترکیب سوجھ نہیں رہی تھی۔ زندگی میں انھیں پہلی بار ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہر حال ان کا وکیل کیس کی پیروی عدالت میں کرتا رہا۔

دریں اثنا شمشیر کے پتا جی نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں ایجنسی کو نونیت کور کی اصلیت پتا کرنے کا کام سونپ دیا۔ کچھ ہی دنوں میں ایجنسی نے اپنی رپورٹ دے دی۔ بقول ایجنسی نونیت کور کے والدین بٹوارے کے وقت لاہور پاکستان سے آئے تھے۔ شاہدرہ، دہلی میں رہتے تھے کہ بیٹی بری سنگت میں پڑ گئی، منشیات کی عادی ہو گئی اور پھر نشے کا کاروبار کرنے والے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گئی۔ دو بھائی تھے، انھوں نے بہن سے پلا ہی جھاڑ لیا مگر والدین کیا کرتے انھیں برداشت کرنے کے بغیر اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کچھ سال کے بعد اسی غم میں گھل کر مر گئے۔ بھائیوں نے مکان بیچا تو بہن نے اپنا حصہ مانگ لیا۔ اِدھر مکان کے روپے ہاتھ میں آ گئے، اُدھر نونیت کے دوستوں کی خرمستیاں بڑھ گئیں۔ آہستہ آہستہ انھوں نے لوگوں کو ٹھگنے کا کام شروع کر لیا۔ ایک طرف فائنانشل کمپنی بنائی جس کے توسل سے لوگوں کو آنکھ جھپکتے ہی امیر بنانے کے سپنے دکھانے لگے اور دوسری طرف کبوتر بازی کا کام شروع کیا جس کی رو سے وہ غریب بے روزگار

نوجوانوں کو خلیج، کینیڈا اور دیگر مغربی ممالک میں نوکری دلانے کا جھانسہ دیتے رہے۔ نونیت کور اس گروہ کی سرگرم رکن تھی اور سر سے پاؤں تک اس ٹھگی میں ملوث تھی۔ شادی سے پہلے کرائے پر لیا گیا دہلی کا فلیٹ محض دکھاوا تھا جو کچھ مہینوں کے لیے کمپنی کے خرچے پر لیا گیا تھا۔ شادی کے لیے کپڑے لتے اور گہنے وغیرہ بھی کرائے پر لیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ شادی کے دوران ماں باپ بھائی بہن بھی کرائے پر ہی لائے گئے۔

وکیل کو جب یہ بات سمجھ آئی اور لڑکی کے چال چلن کے بارے میں پوری جانکاری ملی تو اس نے اپنے موکّل اور اس کے والدین کے ساتھ اس بارے پر چرچا کیا۔ دو ممکنات تھے، ایک کیس کو عدالت سے باہر کچھ روپے دے کر نبٹا لیا جائے بشرطیکہ لڑکی باہمی طلاق دینے پر راضی ہو۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ کیس کو کورٹ میں انجام تک پہنچایا جائے جس صورت میں شمشیر بہت عرصہ تک دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا اور اس کی جوانی ان ہی ہنگاموں میں ضائع ہو جاتی۔ نونیت نے کورٹ میں شمشیر سنگھ پر جہیز مانگنے اور گھر میں مار پیٹ کرنے کا الزام لگایا تھا اور چونکہ وہ ان کاموں میں مہارت رکھتی تھی اس نے اس دن کی مار پیٹ کے بعد نہ صرف پولیس کو گواہ بنایا تھا بلکہ ڈاکٹر کی جھوٹی سرٹیفکیٹ بھی حاصل کی تھی۔ شمشیر سنگھ اور اس کے والدین اتنے لاچار ہو گئے کہ انھوں نے مخالف فریق سے آ رہے پیغامات اور ثالثوں پر مثبت ردعمل ظاہر کیا۔ انجام کار دونوں وکیلوں کے درمیان یہ اقرار نامہ ہوا کہ لڑکی کو یک مشت بیس لاکھ روپیہ بطور نان نفقہ دیا جائے اور اس سے باضابطہ طلاق لے کر کیس کو کورٹ سے خارج کروا دیا جائے۔ آخر کار شمشیر کے وکیل نے بیس لاکھ کا ڈرافٹ دوسرے وکیل کو سپرد کر دیا اور باہمی طلاق کا راضی نامہ لے کر اس سے کورٹ میں پیش کر دیا۔

منصف نے سبھی کاغذات کی پرتال کر کے اور فریقین سے تصدیق کروا کر آخر کار اپنا فیصلہ سنایا۔

"شمشیر سنگھ ولد ستنام سنگھ ساکن عالم باغ، لکھنؤ اور نونیت کور ولد سورگیہ تارا سنگھ ساکن شاہدراہ، دہلی کی طلاق باہمی رضامندی کے ساتھ منظور کی جاتی ہے۔"

فیصلہ سن کر شمشیر سنگھ نے ایک لمبا سا سانس کھینچ لیا جیسے وہ کسی ڈراونے سپنے سے جاگ گیا ہو۔

یومِ حساب

ایک زمانہ تھا کافی ہاؤس کشمیری سیاست کا بیرومیٹر ہوا کرتا تھا۔ دن ڈھلنے سے پہلے ہی سیاست دان، صحافی، دانشور، فن کار، گورنمنٹ ملازم اور طلبہ کافی ہاؤس میں جمع ہوجاتے اور حالات حاضرہ پر بحث ومباحث کرتے۔ ہر کوئی اپنی فراست کی نمائش میں غلطاں و پیچاں رہتا۔ خود نمائی کا ایک یہی تو ذریعہ میسر تھا ان تکیہ زیرکوں کے پاس! مگر اب تو دنیا ہی بدل چکی ہے۔ نہ وہ کافی ہاؤس کا شور وغل رہا اور نہ ہی دانشوروں کے پاس وقت کی فراوانی۔ سب کچھ صارفی تہذیب کھا گئی۔

یہ بات ۱۹۷۵ء کی ہے۔ چار سال قبل پاکستان کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کو یقین ہو چلا تھا کہ اب کشمیر کی علیٰحدگی کے لیے لڑنا فضول ہے۔ سو اس نے اندرا گاندھی سے سمجھوتا کرنا اور از سرِ نو ریاست کی عنان حکومت سنبھالنا غنیمت سمجھ لیا۔ البتہ ان لوگوں کو، جنھیں وہ بائیس سال سے آزادی کے سپنے دکھا رہا تھا، قائل کرنا مشکل تھا۔ اس لیے اس نے تطہیر معاشرہ اور یوم حساب کا راگ الاپنا شروع کر دیا کیونکہ کشمیری قوم رشوت ستانی، کنبہ پروری، غنڈہ گردی اور اخلاقی تنزل سے تنگ آ چکی تھی۔ حالات کی اس کروٹ پر آئے دن بحثیں ہونے لگیں۔ ہر کوئی مستقبل کے حوالے سے فکرمند نظر آ رہا تھا۔

وادی میں بیگ پارتھا سارتھی سمجھوتے کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ کافی ہاؤس کے ہر کونے میں اس موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ ایک میز کے ارد گرد کئی افراد سنجیدگی سے اس سیاسی بدلاؤ پر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک تجربہ کار جرنلسٹ گویا ہوا۔ "بھئی شیخ صاحب کو یوں ہی شیر کشمیر نہیں کہا جاتا ہے۔ اس نے جو چاہا وہ کر دکھایا۔ خبر ملی ہے کہ ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال ہو جائے گی۔ ریاست

میں وزیر اعلیٰ اور گورنر کی جگہ پھر سے وزیر اعظم اور صدر ریاست کے عہدے بحال ہو جائیں گے۔ سن ۵۳ء کے بعد لاگو کیے گئے سبھی قوانین پر نظر ثانی ہوگی۔ ان میں سے جو کشمیری عوام کے مفاد میں نہیں ہوں گے انھیں مسترد کر دیا جائے گا۔"

"یہ تو بہت بڑی حصولیابی ہے۔ آخر بائیس سال سے وہ لڑ رہے ہیں۔ ہندستانی جیلوں میں قید و بند جھیل رہے ہیں۔ کچھ لے کر ہی اپنی سرزمین پر واپس قدم رکھیں گے۔" امر سنگھ کالج کے سیاسیات کے لیکچرر نے اظہار خیال کیا۔

"شیخ صاحب نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ پیکیج میں اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ ہمیں سرکاری اعلان کا انتظار کرنا چاہیے۔" نیشنل کانفرنس سے جڑے ایک سیاست دان نے لقمہ دیا۔

گفتگو میں مصروف بیشتر لوگوں نے اس معاہدے کی نہ صرف تعریف کی بلکہ اس کی تائید بھی کی۔ البتہ کونے میں بیٹھا ایک بظاہر معمولی سا عام آدمی، جس کی عمر پچاس پچپن کے قریب تھی اور جس کے چہرے پر دور دور تک کسی عبقریت کا شائبہ بھی نہ تھا، کہنے لگا۔ "بھئی یہ بات تو سمجھ آتی ہے کہ وزیر اعظم ہند نے شیخ صاحب سے وعدے کیے ہیں مگر کیا کل یہ وعدے توڑے نہیں جاسکتے ہیں یا پھر یہ وعدے وقت کی دھول اوڑھ کر بے اثر نہیں ہوسکتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ یہ وعدے دستور ہند کے دائرے کے باہر کیے جاچکے ہیں یا پھر انھیں دستور ہند کی حفاظت حاصل ہوگی؟ یہ تو محض فریقین کے درمیان ایگریمنٹ لگ رہا ہے جس کی کوئی آئینی گارنٹی نہیں ہے۔ کل جب ریاست میں شیخ محمد عبداللہ جیسا کوئی رہنما نہیں ہوگا، سکم کی طرح اس ریاست کو بھی یونین میں ضم کیا جاسکتا ہے۔"

بات میں بہت وزن تھا یہاں تک کہ سبھی بحث کرنے والے فکر و تردّد میں پڑ گئے۔ ان تاثرات نے ان کے ذہنوں میں جو کھلبلی مچائی وہ اس کے سحر سے باہر نہیں نکل پا رہے تھے۔ انھی

فسوں ساز فقروں کو ذہن میں بسائے وہ سب اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہو گئے۔

دوسرے روز میں اپنے باس نور محمد کے ساتھ کافی پینے کے لیے کافی ہاؤس چلا گیا۔ ساتھ میں دو اور آدمی تھے۔ ایک جو ہمارے گورنمنٹ ایمپوریم کو شال اور پشمینہ سپلائی کرتا تھا اور دوسرا وہاں کا سٹور کیپر۔ وقت گزاری کے لیے کوئی نہ کوئی موضوع تو چاہیے تھا۔ بھلا اس موضوع سے بڑھ کر اور کون سا وقتی موضوع مل سکتا تھا۔ برسر اقتدار آنے کے بعد شیخ صاحب سے کیا امیدیں لگائی جاسکتی تھیں اس پر ہم سب روشنی ڈالنے لگے۔ اسٹور کیپر مایوسی اور اتاولے پن میں باس سے پوچھ بیٹھا۔ ''سر، سنا ہے اب دفتروں میں انقلاب آئے گا۔ شیخ صاحب نے دہلی ہی میں اعلان کر دیا ہے کہ وہ راشی افسروں کو کیفر کردار تک پہنچا دے گا۔ ہر ملازم کو وقت پر دفتر آنا پڑے گا اور وقت پر ہی جانا پڑے گا۔ ہر ملازم کی کارکردگی پر کڑی نظر رکھی جائے گی۔'' سوال پوچھنے کے بعد اس کو اپنی حماقت کا اندازہ ہوا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

نور محمد کے چہرے کی ہوائیاں اڑنے لگیں مگر وہ اس کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جلدی سے کانٹے پر کباب کا ٹکڑا اٹھا لیا اور منہ میں ٹھوس لیا۔ اس کے بعد آرام سے چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔

باس کی دگرگوں حالت دیکھ کر میں نے مداخلت کرنا مناسب سمجھا۔ ''بھئی کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ کئی وزیراعلیٰ آئے اور کئی چلے گئے۔ کرسی سنبھالتے وقت سبھی لوگ ایسی گیدڑ بھبکیاں دیتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے ان کی کشتیوں کا رخ ہوا کے بہاؤ کی جانب مڑ جاتا ہے۔ جھوٹ، مکاری، رشوت خوری اور کنبہ پروری ہمارے معاشرے کا اوڑھنا بچھونا بن چکا ہے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک ایسا کون ہے جو ان بدعتوں سے بچا ہوا ہے؟ اب اٹھائیس سال کے بعد ان بدعتوں کا قلع قمع کرنا ناممکن ہے۔''

نور محمد کی جان میں جان آئی۔ اس لیے وہ بھی گویا ہوا۔ ''ہاں صحیح کہہ رہا ہے مشتاق احمد۔

ہمارا معاشرہ اب اسی رنگ میں رنگ چکا ہے۔ شیخ صاحب تو کیا کوئی فرشتہ بھی اگر آسماں سے اتر آئے وہ بھی ان بدعتوں سے نجات نہیں دلوا سکتا۔"

گفتگو دلچسپ ہوتی جا رہی تھی مگر سپلائر شعبان ڈار جل بنِ مچھلی کی طرح بے چین ہو رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ کمیشن کے بارے میں بات کرنے کے لیے باس کو یہاں لے آیا تھا اس لیے اس موضوع پر بحث کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ چند ہی روز پہلے اس نے بیس لاکھ کے شال ایمپوریم کو سپلائی کیے تھے اور ان کے پاس ہونے اور رقم کی ادائیگی کا انتظار کر رہا تھا۔ شعبان ڈار تعلیم یافتہ نہ تھا مگر سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اس نے وقت کی نزاکت کو دیکھ کر عمداً خاموشی اختیار کر لی۔

اِدھر نور محمد کے اندر لڑکپن کی ترقی پسند انقلابی شخصیت نے دوبارہ سر ابھارا۔ کہنے لگا۔ "دیکھا جائے تو بات بہت معقول ہے۔ ہمارا معاشرہ کرم خوردہ ہے۔ اگر معاشرے کے ہر شعبے کی تطہیر ہو تو ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔" اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ چاہتا تھا کہ سب لوگ اس کے خیالات کی داد دیں۔ وہ باری باری سبھی کی جانب امیدوارانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ارے صاحب چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ تو باسی کڑھی میں ابال آیا ہے۔ جناب آپ نے بتایا نہیں کہ آرڈر پاس ہو گا یا نہیں؟" شعبان ڈار نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"کیوں نہیں ہو گا؟" نور محمد نے پھر اپنی جون بدل لی۔ "لیکن اب کی بار پندرہ فیصد سے کام نہیں چلے گا۔ دوسرے سپلائر اٹھارہ فیصد کمیشن دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ بیس پر راضی ہوں تو میں کل ہی خریداری کمیٹی کی میٹنگ بلا کر آرڈر کی منظوری دلوا دوں گا۔"

"جناب آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔ اتنا ظلم نہ کیجیے۔ اتنی تو کمائی بھی نہیں ہوتی۔ بیس فیصدی تو بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

"بھئی سوچ لو۔ بانٹتے بانٹتے کسی کو کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ بیس سے کچھ کم نہیں ہو سکتا۔

میں مجبور ہوں۔" باس نے ٹکا سا جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جناب۔ جیسے آپ کی مرضی۔ مگر تھوڑی بہت جلدی کر لیجیے۔" شعبان ڈار نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔

"بس تمھاری سبز بتی کی دیر تھی۔ میں کل ہی کیس نپٹا لوں گا۔ تم بے فکر رہو۔" باس نے یقین دلایا۔

بیرا خالی پلیٹ اور کافی کے کپ اٹھا کر چل دیا۔ پھر بل لے کر لوٹ آیا اور شعبان ڈار کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بل کی رقم ادا کی اور ساتھ ہی دس روپے بطور ٹپ بیرے کو دے دیے۔ بیرا بخشش پا کر خوش ہوا مگر اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال سا ابھر آیا تھا۔ اس نے تطہیر کے بارے میں ان لوگوں کی گفتگو سن لی تھی۔ وہ تب سے فکر مند تھا کہ اگر خدانخواستہ معاشرے کی تطہیر شروع ہو گئی اور راشی لوگوں کا یوم حساب آ گیا تو خود اس کا کیا ہو گا؟ یہ انٹلکچول لوگ تو چند پیسے ٹپ دے کر ٹرخاتے ہیں جبکہ بیروں کی خوشحالی کا دارومدار ان کنٹریکٹروں پر ہوتا ہے جو آئے دن بھاری بخشش دے جاتے ہیں۔ اگر ان کی آمدنی بند ہو گئی تو پھر بیروں کو بھی فاقہ کرنا پڑے گا۔ ہمت کر کے وہ باس کی طرف مخاطب ہوا۔ "صاحب، ایک سوال پوچھوں، آپ بُرا تو نہ مانیں گے۔"

"پوچھو بھائی جو کچھ پوچھنا ہے۔"

"صاحب، آپ لوگ جو ابھی کہہ رہے تھے، اگر یہ تطہیر کا کام شروع ہوا تو کیا سارا نظام صاف ہو جائے گا۔ کہیں کوئی بے ایمانی اور بد دیانتی نہیں ہو گی؟ پھر کوئی رشوت دے گا نہ رشوت لے گا؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ ایسا ممکن ہے اگر ہمارے رہنما مخلص ہوں۔ وہ چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا۔"

بیرے کو یاد آیا کہ اس کی آمدنی تو انھی راشی افسروں اور کنٹریکٹروں پر منحصر ہے اور اگر

نظام صاف و پاک ہو گیا تو اس کی آمدنی بھی ختم ہو جائے گی۔ اسی تذبذب میں وہ چلتے چلتے ایک میز کے ساتھ ٹکرایا اور اوندھے منہ گر پڑا۔ ساری کراکری چکنا چور ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام ہوا۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کے سامنے کافی ہاؤس کا منیجر کھڑا اس کو گھور رہا تھا۔ منیجر نے خوب برا بھلا کہا اور حکم دیا کہ ٹوٹی ہوئی کراکری کا ہرجانہ اس کی تنخواہ سے وصول کیا جائے گا۔

بیرے کو یوں محسوس ہوا کہ قسمت نے تطہیر کا ٹھیکرا سب سے پہلے اسی کے سر پر پھوڑ دیا۔

☆☆☆☆☆

فرض شناس

میں اپنے دفتر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آج کوئی منحوس خبر ضرور ملنے والی ہے۔ کوئی کابوسی ڈر تھا جو مجھے پریشان کر رہا تھا۔ دن ہی کچھ ایسے تھے کہ ذہن ہر دم منفی خیالات میں گرفتار رہتا تھا۔ ہڑتالیں، جلسے جلوس، سرکاری کرفیو، سول کرفیو، گولی باری، بم دھماکے، انکاونٹر، ناکہ بندی، ہلاکتیں اور نہ جانے کیا کیا....! جان ہتھیلی پر رکھ کر دفتر چلا جاتا اور جب تک شام کو گھر نہ لوٹتا کسی نہ کسی بُرے حادثے کا منتظر رہتا۔

سارا ماحول اچانک بگڑ گیا تھا۔ کوئی آدمی ایک دو مہینے قبل کشمیر میں رہ کے گیا ہوتا وہ اس بات پر یقین ہی نہ کرتا کہ وادی میں ہر سو موت کے سائے منڈلاتے پھرتے ہیں۔ ہر روز مظاہرے ہوتے، لمبے لمبے جلوس نکلتے اور یو این او کے دفتر میں حاضری دی جاتی۔ ایسے مظاہروں کا ہنگامی طور پر انتظام کرنا بعید از قیاس تھا۔ ممکن ہے کہ اس کارروائی کا منصوبہ خفیہ طور پر بہت عرصہ پہلے بنایا جا چکا ہو۔ ایک منظم کوشش کے تحت انتظامیہ کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ کئی ریاستی اور غیر ریاستی ہستیوں کو اغوا کر لیا گیا جن میں سے کئی لوگ زندہ واپس نہیں آئے جب کہ کئی لوگوں کے متعلقین نے تاوان دے کر ان کی جان چھڑوائی۔

تخریبی کارروائیوں کے لیے ڈاک خانے بہت آسانی سے نشانہ بن جاتے ہیں۔ مشتعل بھیڑ جہاں کہیں لال لیٹر بکس دیکھتی ہے اسے اکھاڑ پھینکتی ہے، جہاں کہیں ڈاک خانے پر نگاہ پڑتی ہے اسے لوٹ پاٹ کر تباہ کرتی ہے اور جہاں کہیں لال ڈاک گاڑی نظر آتی ہے اسے نذر آتش کرتی ہے۔ اس کے باوجود فرض شناس ڈاک ملازم اپنی ڈیوٹی پر پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں اور محکمے کی جائیداد

کی حفاظت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ کشمیر میں بھی ایسا ہی کچھ ہوتا رہا۔ تقریباً پینسٹھ ڈاک خانے یا تو جلائے گئے یا پھران کو لوٹا گیا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی بُری خبر ضرور مل جاتی۔

اس روز میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور کسی انجان شخص نے مجھے بتایا کہ خانیار کے ڈاک خانے میں بم پھٹ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ ان دنوں میں ڈائریکٹر تھا اور پوسٹ ماسٹر جنرل، جو علالت کے باعث دہلی چلا گیا تھا، کی غیر حاضری میں پورے سرکل کی ذمے داری سنبھالے ہوئے تھا۔ موقعے پر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ایسے مشکوک حالات میں کئی افسر یرغمال بنائے گئے تھے۔ لیکن دوسری جانب ڈاک خانے کے ملازمین کا سوال تھا۔ نہ جانے کس حال میں ہوں گے؟ کہیں کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟ یہ سبھی خیالات یکے بعد دیگرے میرے ذہن کو مختل کر رہے تھے۔ میرے روبرو یونین کا ایک لیڈر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی پریشاں ہو گیا۔ میں نے آب دیکھا نہ تاب، ڈرائیور کو سندیسہ بھیجا کہ کار گیراج سے باہر نکالے اور پھر یونین لیڈر کے ساتھ خانیار چلا گیا۔

پندرہ بیس منٹوں میں ہم خانیار پوسٹ آفس پہنچ گئے۔ ڈاک خانہ دوسری منزل پر تھا اور اوپر جانے کے لیے ایک لکڑی کی سیڑھی تھی۔ بم اسی سیڑھی کے نیچے رکھا گیا تھا۔ بم کے پھٹ جانے سے پہلی منزل کو شدید نقصان پہنچ چکا تھا مگر دوسری منزل پر زیادہ اثر نہیں ہوا تھا۔ البتہ سیڑھی زمین سے اکھڑ چکی تھی اور جھولے کی طرح لٹک رہی تھی۔ اس پر بھاری وزن پڑنے سے ہو سکتا تھا کہ وہ اوپر سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑتی۔ بااین ہمہ ڈاک خانے کی حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں اسی لٹکتی ہوئی سیڑھی کا سہارا لے کر لنگور کی مانند ایک، دو اور تین چھلانگیں مار کر اوپر پہنچ گیا۔ میرے ساتھ کھڑا یونین لیڈر، جو عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا، چلاتا رہا۔

''سر، سر، ایسا مت کیجیے، یہ سیڑھی ٹوٹ جائے گی اور آپ کو چوٹ لگ جائے گی۔ سر، پلیز ایسا مت کریں۔ میں ابھی باہر سے کوئی سیڑھی لے کر آتا ہوں۔''

لیکن مجھ پر جنون سوار ہو چکا تھا۔ سواپنی فکر کرنے کے بغیر میں اوپر دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد یونین لیڈر نے قریبی دکان سے ایک سیڑھی کا انتظام کرایا اور خود بھی اوپر پوسٹ آفس میں پہنچ گیا۔

دوسری منزل پر پوسٹ ماسٹر سلطان ڈار اپنے سینے کو بائیں ہاتھ سے پکڑے ہوئے اس روز کا حساب رف اکاونٹ میں ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے سینے میں شدید درد اٹھ رہا تھا مگر وہ اس سے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ تھرتھر کانپ رہے تھے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو چکی تھیں۔ پھر بھی وہ تندہی سے اپنا کام مکمل کرنے میں جُٹا ہوا تھا۔ ہڑبڑی میں اس کو آمدن، خرچہ اور باقی رقم کا حساب نہیں مل پا رہا تھا۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ جونہی اس نے مجھے دیکھا وہ زیادہ ہی پریشان ہو گیا۔ اسے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ کہیں افسر ایسا نہ سمجھے کہ اس نے کوئی خورد بُرد کی ہے۔ میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا:

"سلطان ڈار، زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، حساب آج نہیں تو کل مل جائے گا۔ فی الحال تم میرے گاڑی لے کر گھر چلے جاؤ اور وہاں سے فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس حاضری دو۔ مجھے تمھاری حالت تشویش ناک لگ رہی ہے۔ جتنا کچھ کیش ہے اسے ہم جمع کروا دیں گے۔ تم مطمئن رہو۔ پھر کل آ کر آج کا حساب لکھ لینا۔ ڈاک خانے کی فکر مت کرو، ہم خود ہی تالا لگا کر جائیں گے۔"

لیکن سلطان ڈار کی فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ وہ میری بات ماننے کو راضی نہ ہوا۔ اس کی بغل میں ڈاک خانے کا گروپ ڈی میل بیگ بنا رہا تھا۔ اس نے سبھی رجسٹریاں، پارسل اور منی آرڈر مع ان کی لسٹوں کے تھیلے میں ڈال دیے۔ پھر عام چٹھیاں، پوسٹ کارڈ اور پارسل تھیلے کے حوالے کر دیے۔ اس کے بعد وہ پوسٹ ماسٹر کا انتظار کرنے لگا تا کہ اس میں ڈیلی اکاونٹ کی کاپی

ڈال دے۔اُدھر یونین لیڈر نے بھی سلطان ڈار سے درخواست کی کہ وہ ہٹ کر حساب کی کتاب اس کے حوالے کر دے تا کہ وہ اس کے بدلے حساب ملانے کی کوشش کرے گا۔مگر سلطان ڈار پر اس وقت نہ جانے کون سا بھوت چڑھا ہوا تھا کہ وہ کسی کی سننے کو تیار ہی نہ ہوا۔

یہ پہلی بار تھی جب میں کسی ڈاک بابو کی فرض شناسی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔مجھے تعجب ہو رہا تھا۔میں اندر ہی اندر سوچنے لگا کہ اس کی جگہ میں ہوتا تو کب کا گھر چلا گیا ہوتا۔زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا، تادیبی کارروائی ہوتی۔ایسی حالت تو نہ ہوتی۔یہ غریب لوگ بھی کتنے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔فرض کی خاطر اپنی جان سے کھیل جاتے ہیں۔

یونین لیڈر اور مجھے، دونوں کو اس کے سینے میں اٹھ رہے درد کا اندازہ ہو رہا تھا۔مجھے شک تھا کہ اس کو کہیں ہارٹ اٹیک نہ آیا ہو۔مگر اس نے اپنی صحت کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔البتہ وہ پریشان تھا کہ اس کا حساب نہیں مل رہا ہے۔اس کی پیشانی پسینے سے تربتر تھی۔چہرے پر تھکاوٹ کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔کئی بار وہ اپنی چھاتی کو ایسے دباتا کہ شاید اسی سے درد میں کچھ کمی ہو جائے۔مگر مجھے لگ رہا تھا کہ وہ شدید درد سے اندر ہی اندر چھٹپٹا رہا ہے پھر بھی ظاہر کرنے سے خود کو روک رہا ہے۔

کچھ وقفے کے بعد گروپ ڈی نے اسے پوچھا کہ حساب میں کتنے روپے کا فرق آرہا ہے۔پوسٹ ماسٹر نے جواب دیا۔"دو سو تیس روپے کم ہو رہے ہیں۔"

گروپ ڈی جھٹ سے بول پڑا۔"آپ نے صبح کوئلہ خریدنے کے لیے مجھے دو سو تیس روپے دیے تھے۔میں نے اس کی رسید لا کر آپ کو دی تھی جو آپ نے اس جرنل میں رکھ دی۔"

پوسٹ ماسٹر کو دفعتاً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔اس نے جھٹ جرنل ٹٹولا، اس میں سے رسید نکالی اور اس کا اندراج حساب میں کر لیا اور اس طرح رف اکاونٹ ملا لیا۔پھر ڈیلی اکاونٹ میں نقل اتار کر اس کی کاپی گروپ ڈی کو دے دی۔گروپ ڈی نے میل بیگ بند کر لیا۔یونین لیڈر نے اس

دن کا کیش اور میل بیگ ہیڈ آفس میں جمع کرنے کا ذمہ لے لیا۔ میں نے سلطان ڈار سے کہا کہ میں اس کو گھر پر چھوڑ کر واپس چلا جاؤں گا مگر اتنی دیر میں اس کا کوئی رشتے دار سکوٹر لے کر پہنچ گیا اور وہ اس کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ جاتے وقت میں نے دوبارہ سلطان ڈار کو تاکید کرلی کہ وہ گھر پہنچتے ہی ہسپتال چلا جائے۔ اس کے بعد ہیڈ آفس میں کیش اور میل بیگ جمع کروا کے میں اپنے آفس چلا گیا۔

دفتر پہنچ کر مجھے سلطان ڈار پر ترس بھی آرہا تھا اور فخر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ شدید درد کے باوجود اس نے حساب میں دو سو تیس روپے کی کمی کو ڈھونڈنے کے لیے کم سے کم ایک گھنٹہ صرف کر دیا۔ اتنی دیر میں وہ ہسپتال پہنچ چکا ہوتا اور اس کے مرض کا فوری علاج ہو جاتا۔ اگر اس کے سینے میں اٹھا درد عارضۂ قلب کی وجہ سے تھا تو اس کو بچانے کی کوششیں کی جاتیں۔ جہاں تک حساب ملانے کا تعلق تھا، وہ دوسرے دن بھی ملایا جا سکتا تھا کیونکہ میں نے اس کی اجازت دی تھی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا، حساب نہ ملنے پر جیب سے دو سو تیس روپے دینے پڑتے۔ دوسری جانب مجھے اس کی فرض شناسی پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سرکار کے روپے کو امانت سمجھ رہا تھا اور تب تک اپنی کرسی سے نہیں ہلا جب تک پائی پائی کا حساب نہیں ملا۔ یوں تو جذبۂ دیانت داری ڈاک خانے کے اکثر و بیشتر ملازمین میں ملتا ہے مگر ایسی انتہائی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔

دوسرے روز میں نے ایک پبلک ریلیشنز انسپکٹر کو سلطان ڈار کی خبر لانے کے لیے اس کے گھر بھیج دیا۔ واپسی پر اس نے اطلاع دی: ''سر، سلطان ڈار کو کل رات ہی ہسپتال میں بھرتی کرایا جا چکا ہے۔ دہشت گردی کے سبب آج کل ہسپتالوں کی حالت بہت تشویش ناک ہے۔ اِدھر ہر طرف دھماکے ہو رہے ہیں۔ دھڑا دھڑ گھائلوں کو لایا جا رہا ہے۔ اُدھر ڈاکٹروں اور نرسوں کا کہیں کچھ پتا ہی نہ چل رہا ہے۔ نصف سے زیادہ ڈاکٹر وادی چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں۔ انتظامیہ ٹھپ پڑا ہوا ہے۔ اس لیے مریضوں کی دیکھ بھال نہیں ہو رہی ہے۔ سلطان ڈار بھی اسی دلدل میں پھنسا ہوا

ہے۔"

اس بات کا اندازہ مجھے اس وقت بالکل نہ تھا کیونکہ ہسپتالوں کی صورت حال کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ سیکورٹی کے باعث میں اس کی عیادت کے لیے نہ تو اس کے گھر جا سکا اور نہ ہی ہسپتال۔ صرف مقامی اسٹاف کو اس کی خبر لانے کے لیے وقتاً فوقتاً بھیجتا رہا۔

دو دنوں کے بعد خبر ملی کہ سلطان ڈار خدا کے پاس پہنچ چکا ہے۔ مجھے سن کر بہت افسوس ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کی تصویر ابھر آئی۔ چہرے پر شکنوں کا جال اور پسینے، ذہن میں الجھنیں، بائیاں ہاتھ سینے پر اور دائیں ہاتھ سے قلم گھسیٹنے کی کوشش.....!

اسی روز میں نے سلطان ڈار کو ڈاک سیوا ایوارڈ دلوانے کا قصد کر لیا۔ اس کی فائیل بنائی گئی مگر کچھ روز کے بعد ہی سرکل آفس کے اکثر ملازم وادی چھوڑ کر چلے گئے۔ دفتر مہینے بھر بند رہا اور پھر آدھا مقامی ہیڈ آفس شفٹ ہوا اور آدھا جموں چلا گیا۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی اور اس کے بعد سلطان ڈار کی فائیل کہیں بھی نہ ملی۔ چنانچہ وہ بیچارا اکیلا چلنے والا ملازم تھا جو کسی یونین سے زیادہ نزدیکی سے وابستگی نہیں رکھتا تھا اس لیے کسی یونین والے نے اس کے کیس کی پیروی نہیں کی۔

مجھے آج تک اس بات کا جواب نہیں ملا کہ اس کا کیس کیوں دبا دیا گیا؟ کیا یہ افراتفری کی وجہ سے ہوا یا فرقہ وارانہ ذہنیت کی وجہ سے یا پھر اس کی تجرد پسندی کے سبب؟۔ ایک فرض شناس ڈاک بابو کی قربانی کا نہ اس کے رفیق کاروں کو احساس ہوا اور نہ ہی کسی یونین لیڈر کو۔ وہ اکیلا ہی آخری سفر پر چل پڑا مگر مجھے یقین ہے کہ اس کے اعمال اس کو جنت کا دعوے دار ضرور بنائیں گے۔

☆☆☆☆☆

اندھیر نگری

ایک زمانہ تھا کہ مطبوعہ تحریر کو اکثر مستند مانا جاتا تھا۔ جہاں کہیں کسی اخبار، رسالے یا کتاب میں کوئی بات چھپ جاتی اس پر فوراً یقین کیا جاتا۔ تشکیک کی بہت کم گنجائش ہوتی تھی۔ جہالت اور ضعیف الاعتقادی کی یہ حالت تھی کہ 'جو مانگو گے وہی ملے گا' جیسا اشتہار پڑھا نہیں، جھٹ سے انگوٹھی کے دام روانہ کردیے اور پھر اس کو اللہ دین کا چراغ سمجھ کر مانگوں کی لسٹ سنا دی۔ مانگیں پوری نہ ہونے پر مغلظات پر اتر آتے۔ بھلا انھیں کون سمجھاتا کہ ساڑھے چھ آنے میں مانگیں پوری ہوتیں تو مدھوبالا نے کب کا میرے گھر میں ڈیرا ڈال دیا ہوتا۔ معمہ حل کرنے پر ٹرانزسٹر بطور انعام مل جاتا تھا لیکن اس کا وی پی چھڑانے کے لیے پیکنگ اور لیدر کیس کی قیمت دوسو روپے چکانی پڑتی تھی۔ میناکشی کے مقابل فلم ہیرو بننے کی آرزو میں پہلے بیس روپے بطور اندراج مع چار فوٹو کی لاگت، پھر دو تین بار پچاس، سو اور دو سو روپے بھیجنے پڑتے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ماں باپ، دوست احباب کی جیبیں خالی کرکے روپے بھیجے جاتے اور آخر میں خبر ملتی کہ آپ کا نام فائنل سیلکشن میں رہ گیا اور فلم 'چلا تیواری ہیرو بننے' کی شوٹنگ کچھ روز پہلے شروع ہوچکی ہے۔ ان دنوں کے تین سو پچاس روپے آج کے بیس تیس ہزار کے برابر ہوتے تھے۔ نتیجہ آنے تک بندہ خیالوں میں آٹھوں پہر میناکشی کے ساتھ کشمیر کی پہاڑیوں پر گانے گاتا تھا اور اپنے آپ کو دلیپ کمار یا دیو آنند سمجھتا تھا۔

تب سے زمانے نے کتنی بڑی چھلانگ لگائی ہے۔ احمق ڈبے نے لوگوں کو احمق بنانے کا جیسے ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ چور اچکے مذہبی چولے پہن کر ناظرین کو دن رات بے وقوف بناتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر ہر دوسرے دن کوئی نیا بابا یا پیشوا ظاہر ہوتا ہے جو خوش رہنے اور خدا کو خوش کرنے کے

سب گُر جانتا ہے۔اب تو سو پچاس کی بات ہی نہیں کروڑوں کا ہیر پھیر ہوتا ہے۔ذرا سوچیے جو شخص چینل پر ظاہر ہونے کے لیے کروڑوں خرچ کرتا ہو اس کی کمائی کتنی ہوگی۔ ایسے ایسے معجزے دکھائے جاتے ہیں کہ اگلے زمانے میں پیغمبروں نے بھی نہیں دکھائے ہوں گے۔ یہ کمائی کسی سرمایہ دار سے نہیں بلکہ عام غریب فاقہ کش انسانوں سے ان کا پیٹ کاٹ کرا گاہی جاتی ہے۔فردا کی خوشحالی کے خواب دیکھنے والے یہ غریب اپنے آج کو بد سے بدتر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے ہیں۔ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ مذہب کے ان تاجروں کے سامنے جٹی بھیڑ سب کرائے کی ہوتی ہے جس کے لیے بازار میں باضابطہ بھیڑ جٹانے والے کنٹریکٹر بند ھے ہوتے ہیں۔گھر میں بھوکے بچوں کو پالنے کے لیے، بیوی کی مانگیں پوری کرنے کے لیے، عورت ہو تو ساز و سنگار کے لیے یا پھر نشے کا عادی ہو تو شراب و منشیات کے لیے یہ کرائے کے ٹٹو کوئی بھی ایکٹنگ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور غریب ناظرین ان مناظر کو دیکھ کر جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن اشتہاروں کے بارے میں کچھ نہ پوچھیے۔دس دن میں ویزلی کریم حبش کے باشندے کو پرستان کا شہزادہ بنا دیتی ہے۔حسین ایکٹریس اپنی دراز زلفوں کا راز شرنگار تیل کو بتاتی ہے جو وہ بچپن سے استعمال کر رہی ہے جب کہ تیل کمپنی پانچ برس قبل ہی وجود میں آئی ہے۔کسرتی بدن اور عضلات کو خوشنما بنانے کے لیے سپیشل خصوصی ورزش گاہیں تین مہینے میں سکس پیک بنانے کا دعویٰ کرتی ہیں جبکہ خود اس کا مارواڑی مالک بے ڈول اور بدوضع ہے۔لکی پاوڈر دودھ استعمال کرنے سے بچوں کے ہر سال ایک انچ لمبے ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے جب کہ اشتہار بنانے والے کے بچے ٹھگنے رہ گئے ہیں اور بڑھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔بہر حال یہ آج کی صارفی دنیا کی ٹھگی ہے۔ ناظرین نے جب تک بے وقوف بننے کی ٹھان لی ہے بھلا اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے اور وہ بھی ایسے ملک میں جہاں ساٹھ فیصد سے زیادہ لوگ ان پڑھ ہیں، مزید پچیس فیصد لوگ نقل کر کے چند جماعتیں پاس کر چکے ہیں اور باقی پندرہ فیصد لوگ کثیف ماحول سے حاجز رہنا پسند کرتے ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ میں تمہید باندھتے باندھتے خود بھی جذبات کی رو میں بہہ گیا اور نہ جانے کہاں پہنچ گیا۔ خیر اب آتا ہوں بر سر مطلب۔

دراصل یہ کہانی زیادہ پرانی نہیں ہے بلکہ اس دور کی ہے جب اتنے سارے ٹیلی ویژن چینل نہیں تھے، بس دو چینل ہوا کرتے تھے، دور درشن نیوز اور دور درشن نیشنل۔ صبح سویرے اٹھ کر اخبار پڑھا نہیں بلکہ چاٹا جاتا تھا۔ ان دنوں میں شمال مشرقی ہندستان کی ریاست ترپورا میں تعینات تھا۔ ہمارے یہاں ہاکر روزانہ 'ایسٹ اینڈ ویسٹ ہیرالڈ' چھوڑ جایا کرتا تھا۔ اخبار میں سنڈے کے روز ایک نصیحت آمیز کالم ہوتا تھا جس میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والے نوجوانوں کے سوالوں کے جواب دیے جاتے تھے۔ کوئی محترمہ، جس کی چھوٹی سی فوٹو بھی اس کے نام کے ساتھ چھپتی تھی، سوالوں کا جواب دیا کرتی تھی۔ شکل وصورت سے وہ دانشور کم اور سماجی تتلی زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ سوالوں کے جواب پڑھ کر مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی کیونکہ سائنسی معلومات کی بنا پر وہ جواب غلط اور گمراہ کن ہوتے تھے۔ کئی بار سوچا کہ اخبار کے چیف ایڈیٹر کو خط لکھ کر اس خود ساختہ ماہر نفسیات و جنسیات کی تعلیمی قابلیت اور مہارت کے بارے میں پوچھ لوں کیوں کہ مجھے اس کی قابلیت مشکوک لگ رہی تھی۔ یا تو اس کے پاس صلاح کاری کی کوئی سند ہونی چاہیے ورنہ وہ نوخیزوں کو گمراہ کر رہی تھی اور اتنا بڑا اخبار سماج کے لیے بہت نقصان دہ کام کر رہا تھا۔ بہتر یہ رہتا کہ اخبار کسی ماہر نفسیات کو اس کام پر لگا دیتا۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ میرا تبادلہ نارتھ ایسٹ کے باہر ہو گیا۔ اس طرح ایسٹ اینڈ ویسٹ ہیرالڈ میرے ذہن سے پورا اتر گیا۔

بہت برس کے بعد ایک روز اخبار میں بڑی دھماکے دار خبر چھپی جس پر نظر پڑتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ممبئی میں ایک بار میں کسی لڑکی کا قتل ہو چکا تھا اور سبھی تماش بین دیکھتے رہ گئے تھے۔ خوبصورت لیڈی کا وہاں پر ساقی میخانہ تھی۔ گاہکوں کو رجھانے کے لیے ایسی کئی لڑکیاں بار میں کام کرتی تھیں۔ بار میں چھیڑ چھاڑ تو معمول بن چکی تھی مگر اس رات شراب کے نشے

میں چوردو چار نو جوانوں نے لیتکا سے دست درازیاں لیں۔ وہ کچھ بھی نہ بول پائی۔ کبھی مسکرا کے اور کبھی ہنس کر ٹالتی رہی۔ ان میں سے ایک لڑکے، گجیندر، نے اسے دوبارہ شراب لانے کے لیے بلایا۔ گجیندر مقامی ڈان کا بیٹا تھا جس کو یہ زعم تھا کہ سب سے پہلے سروس کا حق صرف اس کا بنتا ہے۔ غلطی سے لیتکا کسی اور کا ڈرنک بنا کر اس کے ٹیبل پر چلی گئی۔ اس بات پر ناراض ہو کر گجیندر اس کو گالیاں دیتا ہوا چیخنے چلانے لگا مگر لیتکا اس کے تیور دیکھ کر وہاں جانے سے کترائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گجیندر نے اپنا پستول نکالا اور وہیں سے لیتکا کے سینے میں ساری گولیاں داغ دیں اور وہ بیچاری لہولہان فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ ہر سو ہنگامہ مچ گیا اور ڈر کے مارے تماشائیوں کو جدھر کوئی نکاسی سوراخ ملا، وہیں سے بھاگ نکلے۔ کسی نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کون مرا، کس نے مارا اور ماجرا کیا تھا؟

اخبار پڑھتے پڑھتے جونھی میری نظر ایک لائن پر پڑی، میرے ہوش وحواس اڑ گئے۔ لکھا تھا کہ یہ بار جوگا ساہنی کا ہے جو اس شہر کی جانی مانی سوشلائیٹ ہے اور بڑے بڑے سرکلوں میں اس کے تعلقات ہیں۔ میں نام پڑھ کر کچھ چونک سا گیا۔ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دماغ پر بہت زور ڈال کر آخر کار مجھے یاد آیا کہ یہ وہی نام نہاد صلاح کار ہے جو 'ایسٹ اینڈ ویسٹ ہیرالڈ' میں نفسیاتی وجنسی معاملات پر مشاورتی خدمت کیا کرتی تھی۔ تب کہیں جا کر تار سے تار جڑ گئے۔ نہ کوئی اعلیٰ ڈاکٹری یا نفسیاتی ڈگری، نہ تعلیم اطفال کا کوئی تجربہ، بس انگریزی کے چار لفظ بولنے اور لکھنے کی صلاحیت، تتلیوں کا نیٹ ورک اور پھر دل پر ضرب لگانے والی مسکراہٹ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سند چاہیے تھی اسے۔ اسی سند پر وہ ایسٹ اینڈ ویسٹ ہیرالڈ کے قارئین کو سالہا سال سے نفسیاتی اور جنسی الجھیڑوں کو سلجھانے کے لیے ماہرانہ رائے دے رہی تھی۔ خیر دوش اس کا نہیں تھا، دوش تو اس میڈیا کے انتظامیہ کا تھا جو سستی شہرت کے لیے ایسے ناتجربہ کار لوگوں سے خدمت لیتے رہتے ہیں۔ میں من ہی من میں کڑھتا رہا اور اپنے ملک کے عبقری طبقے پر ہنستا رہا جو شوخ شراروں کو ذہنی جولانیوں سے تعبیر دیتے ہیں۔

گجیندر کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ پولیس پر جیسے فالج گر پڑا تھا۔ کوئی گواہ سامنے آنے کو تیار نہ تھا۔ جن کے نام اس روز شراب بیچی گئی تھی سب یہی کہہ رہے تھے کہ ہم موقعِ واردات پر موجود نہ تھے۔ پہلے ہی چلے گئے تھے۔ مگر بھلا ہو عدالت عالیہ کا جس نے اپنی نگرانی میں پورے معاملے کی از سر نو چھان بین کروائی اور ملزم کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔

اس دن کے بعد جوگا ساہنی صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ اب نہ کہیں اس کا نام سنائی دیتا ہے اور نہ ہی کہیں اس کی تصویر نظر آتی ہے۔ نہ ایسٹ اینڈ ویسٹ ہیرالڈ میں اس کا کالم چھپتا ہے اور نہ ہی وہ نئی نسل کو گمراہ کرتی ہے۔

کسی دہریے نے سچ ہی کہا ہے کہ ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں خدا کے وجود پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔

AB MAIN WAHAN NAHIN REHTA

(Collection of Short Stories)

By : Deepak Budki

مصنف کے بارے میں

نام : دیپک کمار بدکی

قلمی نام : دیپک بدکی

پیدائش : ۱۵؍فروری ۱۹۵۰ء (سرینگر، جموں وکشمیر)

ای میل : deepak.budki@gmail.com

موبائیل : 9868271199

تعلیم : ایم ایس سی (بوٹنی)؛ بی ایڈ؛ ایسوسی ایٹ، انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، این ڈی سی (ndc)

پیشه : ریٹائرڈ ممبر، پوسٹل سروسز بورڈ، نئی دہلی؛ نو سال آرمی پوسٹل سروس میں ڈیپوٹیشن پر رہا، بطور لیفٹننٹ کرنل واپسی؛ مختصر مدت کے لیے صحافت اور کارٹوننگ سے وابستگی؛ ریڈیو اور دوردرشن پروگراموں میں شرکت۔

کارنامے : ۱۹۷۰ء میں ادبی زندگی کا آغاز؛ ۸۷ء تا ۹۶ء قلمی تعطل؛ تقریباً ۱۲۰؍افسانے، ۲۶۰؍تبصرے اور ۶۰؍تنقیدی و تحقیقی مضامین قلم بند۔ کئی افسانے ہندی، تیلگو، مراٹھی، کشمیری، پہاڑی اور انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ چند ایک دوردرشن پر ٹیلی وائز ہو چکے ہیں۔

بلاگس : deepakbudki.com; budki.blogspot.in

تصانیف : افسانے۔ ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب؛ افسانچے: مٹھی بھر ریت؛ مضامین و تبصرے۔ عصری تحریریں، عصری شعور، عصری تقاضے، عصری تناظر، اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

مقالہ (for ndc) : Genesis of Kashmir Problem & Article 370

گوشے : 'شاعر ممبئی' ستمبر ۲۰۰۴ء، 'انتساب' سرونج ۲۰۰۶ء، 'اسباق' پونے جولائی ۲۰۰۷ء

خصوصی نمبر : 'انتساب عالمی' سرونج (دیپک بدکی نمبر)، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

انعامات : انٹرنیشنل فرینڈشپ سوسائٹی کی جانب سے شری بی این سنگھ سابقہ گورنر آسام اور تامل ناڈو نے ۲۰۰۹ء میں راشٹریہ گورو سمان سے نوازا۔

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-86486-00-4